بسم الله الرحمن الرحیم

شعور اتحاد

سال سوم ۞ شمارہ (۹) ۞ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ ۞ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء

پیشکش: مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی

نگران اعلیٰ: آیۃ اللہ محمد علی تسخیری

مدیر مسؤل: علی اصغر اوحدی

علمی گروہ کی زیر نگرانی

چیف ایڈیٹر: سید احتشام عباس زیدی

سہ ماہی ''شعور اتحاد'' مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو مستحکم بنانے نیز عالم اسلام کو فقہی، حقوقی، کلامی، فلسفی، تاریخی و... میدانوں میں درپیش مشکلات اور دشواریوں کے حل کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔

یہ مجلّہ مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے متعلق لکھے جانے والے علمی مقالوں کا استقبال کرتا ہے۔

یہ مجلّہ مقالات کی ایڈیٹنگ اور تلخیص میں آزاد ہوگا۔

مجلّہ کے مطالب نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن حوالہ ضروری ہے۔

....

ایڈریس: تہران، خیابان آیۃ اللہ طالقانی، شمارہ ۳۵۷ ''مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی'' معاونت فرہنگی و پژوہشی

ٹیلی فون: ۳۔۸۸۳۲۱۴۱۱۔۸۸۸۲۲۵۳۲۔ فیکس: ۸۸۳۲۱۴۱۴۔۸۸۳۲۱۶۱۶۔۲۱۔۰۰۹۸

قم: خیابان ساحلی، نبش لواسانی ۱۷، پلاک ۱۶۱/ کوڈ پوسٹ ۳۷۱۶۶۳۶۵۷/ ٹیلی فون ۷۷۵۵۴۶۴/ ۶۔۷۷۵۵۴۴۵۔۲۵۱۔۰۰۹۸

ای میل andisheh@taqhrib.org

فہرست

حج کے جلوے .... اداریہ ۵

فکر و شعور

اسلامی میانہ روی کے تمدّنی پہلو .... آیۃ اللہ محمد علی تسخیری ۱۱

آزادی بیان دینی تعلیمات۔۔۔.............................سید مصطفیٰ میر محمدی ۲۵

عدالت اور حکومت امام علیؑ کی نظر میں.................................. مصطفےٰ خلیلی ۴۷

امام صادق علیہ السلام اور آپ کی سیاست ....سید نجیب الحسن زیدی ۶۵

حج مرکز اتحاد و بندگی...سید احتشام عباس زیدی ۹۳

فقہ مقارن کا مختصر تعارف ....محمد رضا ضمیری ۱۰۵

اتحاد کے علمبر دار

سید محسن بن عبدالکریم امین عاملی شقراوی ....رحیم ابوالحسینی ۱۲۹

عبدالمجید سلیم محافظ شریعت ....ماخوذ از اندیشہ تقریب شمارہ ۷ ۱۴۹

عالم اسلام کا تعارف

قدیم مصر ... ہرم سے حرم تک..ر۔ امیر دہی ۱۸۳

اداریہ

حج کے جلوے

حج اسلام کی ان عبادتوں میں سے ہے جسے ارکان اسلام میں شمار کیا گیا ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے:

''بُنیَ الاسلامُ علیٰ خمسةِ أشیاء ...... الحجّ ...... '' (کافی،ج۲/ص۱۸)۔

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے جن میں سے ایک حج بھی ہے''

یہ وہ عبادت ہے جس کا جان بوجھ کر ترک کرنا اللہ کی نعمت سے انکار اور کفر ہے:

﴿ و للّٰہ علی الناسِ حجُّ البیتِ مَنِ استطاعَ الیه سبیلاً وَ مَن کفرَ فانَّ اللّٰہ َغنیٌّ عنِ العالمینَ﴾

اللہ کی طرف سے صاحب استطاعت لوگوں کے اوپر حج واجب ہوا ہے،اور جو اس سے انکار کرے تو اللہ عالمین سے بے نیاز ہے۔(آل عمران/۹۷)

تمام اسلامی تعلیمات حج کے اندر جلوہ گر ہیں اور حج کی پوری عبادت میں جگہ جگہ اس کے روشن نمونے نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حج اسلام کا مجموعہ اور اس کی بقا و دوام کا ضامن ہے۔دنیا کے کونے کونے سے سمٹ کر خانہ کعبہ کے مرکز پر جمع ہونے والے مسلمان اس عبادت کو عالمی عبادت کا چہرہ فراہم کرتے ہیں۔اللہ کا گھر تمام انسانوں کا گھر ہے اور تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بنایا گیا ہے۔

مسلمانوں کا دنیا کے ہر علاقے سے مختلف سواریوں کے ذریعہ یا پیدل ہی ایک نقطہ پر جمع ہونا،اللہ سے ان کے عشق کا پتا دیتا ہے۔اللہ کا گھر تمام انسانوں کے لئے امن وامان اور آرام وسکون کی جگہ بنایا گیا ہے:

﴿و اذ جعَلنا البیتَ مثابةً للنّاس و امناً...... ﴾ (بقرہ/۱۲۵)

ساتھ ہی یہ گھر تمام انسانوں کے لئے قیام کی جگہ بنایا گیا ہے:

﴿ جعَل اللّٰہ الکعبةَ البیتَ الحرامَ قیاماً للنّاسِ ...... ﴾(مائدہ/۹۷)

بندگی کے لئے قیام، اللہ کی اطاعت کے لئے قیام، کفروشرک کے خلاف قیام، برائیوں اور بدعتوں کے خلاف قیام اور صدق وصفا، اخلاق ومروت، اخوت و برابری نیز اتحاد و وحدت کے لئے قیام۔

حج کے لباس یعنی احرام کی یک جنسی و یک رنگی اور طواف وسعی، عرفات کے وقوف، مزدلفہ کے بیتوتہ، رمی جمرات، قربانی اور منا میں قیام کی یکسانیت اسلامی اتحاد کی وہ بے نظیر جلوہ گاہیں ہیں جن کی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔ پورے عالم اسلام کا یہ بے مثل اجتماع مسلمانوں سے جس محور پر جمع ہونے کی تاکید کرتا ہے وہ اتحاد و وحدت ہے۔ بغیر اتحاد و وحدت کے، حج ایک بے روح عبادت ہے اور بے رنگ اعمال کا مجموعہ ہے جس سے نہ کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے نہ اخروی نفع نصیب ہوسکتا ہے۔

حج میں ہر مسلک و مذہب کے مسلمان کی زبان سے نکلنے والی ''لا الہ الاّ اللہ'' اور تکبیر کی آوازیں یہ نہیں بتاتیں کہ یہ شیعہ کی تکبیر وتہلیل ہے یا اہل سنت کی بلکہ پورا مجمع ایک آواز اور ایک صدا ہوتا ہے۔ اللہ کے ایک گھر کے گرد طواف کرنے والے تمام مسلمان ایک محور کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں اور ایک ہی گھر کی سمت سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ نماز کے اوقات میں تو یہ منظر اور بھی دلکش اور دل آویز ہوجاتا ہے جب پوری ملت اسلامیہ کے افراد مسجد الحرام یا مسجد النبی میں ایک ہی وقت میں نماز ادا کرتے ہیں اور ہر مذہب ومسلک کے مسلمان شانہ با شانہ معبود حقیقی کی بارگاہ میں قیام وقعود اور رکوع وسجود کے روح پرور مناظر پیش کرتے ہیں وادی عرفات ہو یا وادی مزدلفہ اور منیٰ اگر کوئی غیر مسلم ان اجتماعات کو دیکھے تو اسے اندازہ لگانا بہت مشکل ہوگا کہ مسلمانوں میں کوئی تفرقہ بھی پایا جاتا ہے۔ کیا یہ مسلمانوں کے عالمی اتحاد کا بہترین نمونہ نہیں ہے؟ احرام باندھنے کی ابتدا سے احرام سے باہر آنے تک مختلف اوقات میں تلبیہ اور تکبیریں تمام مسلمانوں کی دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہیں کاش مسلمان ان تکبیروں کی حقیقت اور ان کی روح سے بھی آگاہ ہوتے ہمیں ان تکبروں کو بت شکن تکبیروں میں بدلنا چاہئے، تاکہ مسلمانوں کے ظاہری اور باطنی تمام بت ان کی دھمک سے ٹوٹ جائیں حج ان تکبیروں اور تلبیہ کے ذریعہ سب سے پہلے نفس کے بتوں کو توڑنے کی تعلیم دیتا ہے باطل خواہشات کے بت ہوا وہوس کے بت طبقات کے بت، اسی کے ساتھ ظاہری بتوں کو بھی توڑنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ خدائے وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی اور کو بڑا مانیں اور اس کے علاوہ کسی اور کے آگے جھکیں۔ جبھی ہماری تکبیریں ابراہیمیؑ تکبیریں بن

جائیں گی اور ہمارا حج ابراہیمیؑ حج ہوگا جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی روح اتحاد کی شکل میں رواں دواں ہوگی۔ امام خمینیؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''ہمیں جاننا چاہئے کہ دنیا کے کونے کونے سے اس مقدس مقام اور نزول وحی کی جگہ پر باہم جمع ہونے والے مسلمانوں کے اس عظیم اجتماع کا ایک فلسفہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کی پیروی کرنے والے دنیا کے طاغوتوں کے مقابل متحد ہو جائیں'' (صحیفہ نور: ۲۰۲/۱۹)

واقعی ہولوکاسٹ

آج اگر مسلمان حج کی برکتوں سے فیضیاب ہوکر اپنے درمیان اتحاد و یکجہتی قائم کرتے اور جس طرح حج میں ایک دوسرے کے شانے سے شانہ ملا کر نماز اور دیگر اعمال بجالاتے ہیں اپنے اجتماعی اور سیاسی مسائل میں بھی اتحاد کو مدنظر رکھتے تو عالم اسلام ان بدترین حالات سے دوچار نہ ہوتا اور ڈیڑھ ارب سے زیادہ جمعیت والی قوم دنیا کی پست قوم نہ کہلاتی۔

آج مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اور اختلافات کی وجہ سے مسلمانوں کے پیغمبر کی آسانی سے توہین کردی جاتی ہے اور رحمۃ للعالمین اور صاحب خلق عظیم کو معاذ اللہ ظالم و خونخوار اور پست کردار کا انسان کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب حکمت و ہدایت کو ظلم و ستم اور دہشت گردی پھیلانے والی کتاب کہدیا جاتا ہے، اور ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمان منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے درمیان تفرقہ کی وہ بدترین صورت ہے جس میں ان کی تقدیر کا فیصلہ بڑی طاقتیں کرتی ہیں ان کی جغرافیائی حدود کی تعیین، استعمار کے قلم سے ہوتی ہے، جن کے اوپر حکمراں استعمار کے مفادات کے خواہاں افراد ہوتے ہیں اور جن کی نام نہاد حکومتیں استعمار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے بھائیوں اور بہنوں پر اور چھوٹے چھوٹے مسلمان بچوں پر ظلم ڈھانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتی ہیں۔

غزہ ایسی جگہ ہے جہاں عالم اسلام کی اکثریت سے تعلق رکھنے والے افراد ہی رہتے ہیں۔ اگر وہاں مسلمان بھی نہ ہوتے اور عام انسان رہتے جب بھی مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ اگر کوئی ظالم ان پر ظلم کرتا تو اس کے خلاف کھڑے ہوتے اور مظلوموں کی حمایت کرتے۔ لیکن یہ کیا ستم ہے کہ آج تین برس کے قریب ہو رہے ہیں، اپنی سرزمین پر زندگی بسر کرنے والے اور اپنے حق کے لئے لڑنے والے غزہ کے پندرہ لاکھ مظلوم مسلمان اسرائیل

جیسے مسلمانوں کے خوں خوار دشمن کے آگے نہ جھکنے کے جرم میں اپنی زندگی کی ابتدائی اور بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم کر دیئے جاتے ہیں اور ان پر زمینی اور دریائی تمام راستے بند کر دئے جاتے ہیں۔ بجلی، پانی، دوا اور غذا جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم ان بے چاروں پر نہ صرف جنگ تھوپ دی جاتی ہے بلکہ ان پر فاسفورس بموں کی بارش بھی کی جاتی ہے۔لیکن یہ جیالے اپنی شجاعت سے ظالم کو جنگ بند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

اگر ان کے دشمن صرف صہیونی درندے ہوتے تو ان سے نپٹنا ان کے لئے بہت آسان ہوتا۔لیکن ان کی پیٹھ میں چھرا تو ان کے بھائی گھوپ رہے ہیں۔ تاریخ میں اتنی بڑی جیل شاید کہیں اور نظر نہیں آتی جتنی بڑی جیل غزہ کی سرزمین ہے، جس میں پندرہ لاکھ قیدی متمدن دنیا سے بالکل کاٹ کر رکھدئے گئے ہیں۔عرب کی تمام چھوٹی بڑی حکومتوں نے ان کے ساتھ واقعی سوتیلا سلوک کیا ہے، خاص طور سے مصر جیسی حکومت نے تو ان بیچاروں پر اسرائیلیوں سے زیادہ ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں اور انہیں آہنی دیواروں میں بند کر دیا ہے۔ کیا یہ تاریخ کا واقعی ہولوکاسٹ نہیں ہے۔جس کے قیدیوں پر آسمان سے آگ برستی ہے، انہیں بھوکا رکھا جاتا ہے اور فرار کے سارے راستے ان پر بند ہیں۔ ہاں! آج اگر یہ اپنی آبرو دشمن کے ہاتھوں بیچ دیں اور اسرائیل کی بے چون وچرا غلامی اختیار کرلیں اور اپنی سرزمین کو اپنی مادر وطن کہنا بھول جائیں تو ان کے لئے سارے دروازے کھول دئے جائیں گے لیکن کیا یہ کسی غیرت دار، وطن پرست اور مسلمان قوم سے ممکن ہے؟

فکر و شعور

اسلامی میانہ روی کے تمدّنی پہلو

آیت اللہ محمد علی تسخیری
ترجمہ: منور حسین ناصری

خلاصہ:

انسان کی خلقت کا مقصد خداوند متعال کی بندگی ہے طاغوت اور ہر وہ گروہ جو اعتدال سے خارج ہو جائے اسلام ان کی مخالفت کرتا ہے۔

اللہ پر ایمان نہ لانا اور خود ساختہ خداؤں کے آگے سر جھکانا (انسانی معاشرے میں) سرکشی اور اس کے عدم تحفظ کے اہم ترین اسباب ہیں، جبکہ اسلام کی پوری کوشش یہ ہے کہ ایمان کو فروغ دے کر بشریت کی خدمت میں صلح و عدالت کا تحفہ پیش کرے۔

اسلام ایسے معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے جس میں صلح و سلامتی، خدا کی عبادت اور طاغوت سے بے زاری پائی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل بھی دہشت گردی کو روکنے، اور روئے زمین پر عادلانہ صلح برقرار کرنے کی خواہاں ہے اس مقالہ میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی اس راہ میں کامیابی کے لئے جو طریقہ کار ہے اسے پیش کیا جائے گا۔

کلیدی الفاظ:

انسان کی خلقت، تحفظ، عالمی صلح، عدالت، اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل۔

تمہید:

جن افراد نے اسلام کے بارے میں (ذرہ برابر بھی) مطالعہ اور تحقیق کی ہے ان کے لئے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اپنی مخلوقات کی خلقت سے خداوند عالم کا مقصد، انہیں کمال تک پہنچانا اور ان میں موجود مختلف صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے انسانی فطرت بھی جب عالم ہستی اور اس میں موجود ہماہنگی کو ملاحظہ کرتی تب بھی اس نتیجہ پر پہنچتی ہے۔

قرآن کریم انسان کی خلقت کے مقصد کے بارے میں واضح طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"**وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون**" (زاریات / ۵۶):

میں نے جن وانس کو اپنی عبادت کے لئے خلق کیا ہے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانی کمال اس وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم کی بندگی اس کے وجود کا ایک حصہ بن جائے شخصیت پیغمبرؐ میں کمال اپنے اوج پر تھا، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کو جو بلند ترین صفت عطا ہوئی تھی وہ (نعم العبد) تھی، یعنی خدا کا بہترین بندہ، خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿**وَ وَهَبْنا لِداوُدَ سُلَيْمانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ**﴾ (ص/۳۰)

''ہم نے داود کو سلیمان جیسا فرزند عطا کیا جو بہترین بندہ اور توبہ کرنے والا تھا''

جب با ایمان شخص خدا کے رسول اور سرور کائناتؐ کے پیغمبر ہونے کی گواہی دیتا ہے تو آپ کی بندگی کو آپ کی پیغمبری پر مقدم کرتے ہوئے کہتا ہے ''**اشهد ان محمداً عبده و رسوله**'' میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے بندہ اور اس کے پیغمبر ہیں۔

یہ موضوع انسانی معاشرے پر بھی صادق آتا ہے، انبیاء اور خدا کے صالح و شائستہ بندوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسا معاشرہ تشکیل دیں جس میں تمام لوگ خدا کے بندے ہوں، یعنی سب کے سب خدائی ہوں۔

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنا فی کُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوت﴾ (نحل آیت/۳۶)

ہم نے ہر امت میں ایسا پیغمبر بھیجا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے اور طاغوت سے اجتناب کرے لہٰذا ایک ایسی راہ جو صحیح، معتدل اور انسان کو کمال تک پہنچانے والی ہو اس کے دو عنصر ہیں۔ ا: اللہ کی بندگی ۲: طاغوت سے اجتناب اور دوری، ان دونوں عناصر کو اس کی خالصانہ عبادت کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔

عبادت اور طاغوت کا مفہوم:

اسلامی مفہوم میں عبادت کا مطلب امر بالمعروف و نہی عن منکر کے اجراء اور خداوند عالم کی اطاعت کے لئے زندگی کو ہموار بنانا ہے۔

﴿یا أَیُّهَا الَّذینَ آمَنُوا اسْتَجیبُوا لِلَّهِ وَ لِلرَّسُولِ إِذا دَعاکُمْ لِما یُحْییکُم﴾ (انفال آیت/۲۴)

''اے ایمان والو اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمھیں اس امر کی طرف دعوت دیں جس میں تمھاری زندگی ہے۔ (جو تمھاری حیات کا ضامن ہے)''

یہاں بندگی سے مراد اس کا ایک خاص مفہوم ہے یعنی نماز اور روزہ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد پوری زندگی ہے جو (نماز، روزہ اور مسجد) کی طرح پاک و پاکیزہ اور مقدس ہو کے زندگی کا خلاصہ ہو کر نہیں رہے گی بلکہ پوری زندگی مسجد اور نماز میں تبدیل ہو گی۔

(اسلام کی نظر میں طاغوت سے مراد احدّ عتدال اور میانہ روی سے تجاوز کرنا ہے جیسا کہ راغب اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں:

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْماءُ حَمَلْناکُمْ فِی الْجارِیَة﴾ (الحاقہ، آیت/۱۱)

''ہم نے تم کو اس وقت کشتی میں اٹھا لیا تھا جب پانی چڑھ رہا تھا) طغیان کی تعریف حد سے تجاوز کرنے سے کی ہے۔ (مفردات: ۳۰۵)''

اسلام میں اعتدال اور میانہ روی سے مراد ہے، عدل، توازن، حکمت، عقلمندی اور ہر چیز کا اس کی پرکھنا تاکہ اس سے مقصد حاصل ہو جائے۔

البتہ یہاں پر معیار عدد اور گنتی نہیں ہے کیونکہ امت اسلامی درمیانی اور معتدل ہے ﴿وَ کَـذٰلِکَ جَعَلْناکُمْ أُمَّةً وَسَطا﴾ (بقرہ آیت/۱۴۳) اور ہم نے اس طرح تم کو درمیانی امت قرار دیا ہے پیغمبر اکرمؐ کی پیروی کا نمونہ، دوسری امتوں کے لئے متمدن نمونہ ہوگا، اسلام اگر کچھ باتوں کو ناپسند کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مفاہیم اعتدال اور میانہ روی کی حد سے خارج ہیں۔

شرک والحاد، عریانیت، برے اعمال، فضول خرچی، اور حتی کہ رہبانیت، بخل، خوف وہراس اور ذمہ داریوں کا احساس نہ ہونا یہ سب شرعی حدود سے تجاوز کر جانے کی مثالیں ہیں۔

لہٰذا انسان کے لئے وہ حدود معیاری حیثیت رکھتے ہیں جنھیں اللہ نے اس کے لئے قرار دیا ہے اور وہ اتنے واضح و آشکار ہیں کہ جن کو انسانی ضمیر با آسانی درک کر سکتا ہے جیسے طیبات (اچھائیاں) اور خبائث (برائیاں)

اللہ حد اعتدال کی وہ کامل تصویر پیش کرتا ہے کہ اس سے تجاوز کر جانا خود اپنے سے تجاوز اور اپنے کو فراموش کرنے کے مترادف ہے، جیسا کہ یہ آیہ کریمہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے: ﴿وَ لا تَـکُـونُـوا کَالَّذینَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْساهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولئِکَ هُمُ الْفاسِقُون﴾ (الحشر آیت/۱۹)؛ انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کو بھی بھلا دیا اور وہ سب فاسق ہیں۔

عالم بشریت کا چین وسکون ہمیشہ سرکش اور فاسق لوگوں کی دھمکیوں کی زد پر رہا ہے۔ اگر ہم انسانی خون اور آنسوؤں کی ندیوں اور ناموس وانسانیت کی ہونے والی آبروریزی پر نظر ڈالیں تو (بقول شہید باقر الصدر) ان سب کی دو بنیادی علتیں ہیں۔

۱: ضلالت وگمراہی۔

۲: طرف داری میں حد سے بڑھنا اور فرضی حقائق کو واقعی پر ترجیح دینا کہ اسلام جسے (الحاد، یعنی خدا اور دین کی نفی کرنا) اور (شرک) کے نام سے یاد کرتا ہے یہ دونوں انسان کے تکامل کی اور اس کی شائستگی واخلاقیت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں اور ان کا صرف ایک علاج ہے (الفتاویٰ الواضحۃ: ۵۹۵) اور وہ خدائے یکتا پر ایمان اور اس کے روبرو احساس ذمہ داری کرنا ہے۔

اس لئے خود ساختہ خداوؤں پر ایمان کو اللہ کی نسبت بغاوت اور سرکشی کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ دونوں عوامل ہیں جو آوارگی ،شہوت،حب جاہ و مال اور بعض حاکموں وسرمایہ داروں کی اندھی تقلید کرنے جیسی بیماریوں کو جنم دیتے ہیں۔

یہ تمام امور وہ ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسکے باوجود بعض افراد جہالت ونادانی کی وجہ سے انہیں کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں جس کے نتیجہ میں انسانیت تباہ و برباد ہوکر رہ جاتی ہے اور اپنے واقعی چین و سکون کو ہاتھ سے گنوا دیتی ہے۔

انسانی تحفظ کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں،مثلاً فکری،سماجی،اخلاقی،انسانی،خاندانی،سیاسی واقتصادی اور ماحولیاتی وغیرہ ....کہ جو سرکشی اور حد سے تجاوز کر جانا انسانی تحفظ کے ان تمام پہلوؤں کے لئے ایک بڑا خطرہ ہے۔اور افراط وتفریط یہ سب تحفظات کے لئے چیلنج ہے

فرعون بغاوت وسرکشی کا ایسا نمونہ ہے کہ جسے قرآن اس طرح یاد کرتا ہے''اذْهَبْ إِلى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغى ''(طہٰ آیت/۲۴)؛فرعون کے پاس جاؤ کہ اس نے سرکشی کی ہے،وہ سرکش ہوگیا ہے۔''إِنَّ فِرْعَوْنَ لَعالٍ فِي الْأَرْضِ وَ إِنَّهُ لَمِنَ الْمُسْرِفينَ''(یونس آیت/۳۸) کہ فرعون روئے زمین میں بہت بڑا بن رہا ہے ،یعنی زمین پر اپنی برتری دکھاتا ہے اور وہ اسراف کرنے والوں میں سے ہے، یہاں تک کہ ایمان لانے کے لئے بھی اس کی اجازت کی ضرورت ہوتی تھی''قالَ فِرْعَوْنُ آمَنْتُمْ بِهِ قَبْلَ أَنْ آذَنَ لَكُم ''(اعراف:۱۲۳) فرعون نے کہا، کہ اس سے پہلے کہ میں اجازت دوں تم ایمان لے آئے ؟یعنی میری اجازت سے پہلے تم کیسے ایمان لے آئے؟

اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَها شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْناءَهُمْ وَ يَسْتَحْيي نِساءَهُمْ إِنَّهُ كانَ مِنَ الْمُفْسِدينَ ﴾ (قصص آیت۴)

یقیناً فرعون نے روئے زمین پر برتری کا مظاہرہ کیا (بلندی اختیار کی) اور اس نے اہل زمین کو مختلف

حصوں میں تقسیم کر دیا کہ ایک گروہ کو ناتوان اور کمزور بنا دیا، وہ لڑکوں کو ذبح کر دیا کرتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھا کرتا تھا وہ یقیناً مفسدین میں سے تھا۔

فرعون امت کو سبک اور حقیر شمار کرتا تھا﴿ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْماً فَاسِقِينَ ﴾ (زخرف آیت/۵۴)؛ فرعون نے اپنی قوم کو (سبک سر بنا دیا) حقیر کیا اور انھوں نے اس کی پیروی کی، حقیقت میں وہ فاسق اور بدکردار قوم تھی۔

انسانی تحفظ کے قیام کے لئے اسلام کا کردار

اسلام اب تربیتی اور اخلاقی نظام پیش کرتا ہے جس کے ذریعہ انسانیت کو اخلاقی تحفظ حاصل ہوسکتا ہے۔﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيهِمْ ﴾ (جمعہ آیت۲) اس خدا نے مکے والوں میں (ان پڑھ لوگوں میں) ایک رسول بھیجا ہے جو انہیں میں سے تھا کہ ان کے لئے آیات کی تلاوت کرے اوران کا تزکیہ نفس کرتے اورانہیں پاکیزہ بنائے آسمانی دین اخلاقی برائیوں پر پابندی لگاتا ہے کیونکہ ان سے انسانیت مرجھاتی ہے اور ہر وہ شیئ جو اخلاقیات انسان کے لئے خطرہ ثابت ہوسکتی ہے اس سے سختی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ خاندان کے ڈھانچہ کو تشکیل دیتا ہے، اس کے حدود معین کرتا ہے اور ہر وہ شیئ جو بے عفتی اور عریانیت کی طرف انسان کو لے جاسکتی ہے اس کو مذموم قرار دیتا ہے۔ اس طرح ایک انسانی سماج کے لئے اخلاقی تحفظ فراہم کرتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا اجتماعی نظام دنیا کے حوالے کرتا ہے جس میں رنگ، نسل، زبان، قوم وقبیلہ، جغرافیا وغیرہ جیسے ظاہری امتیازات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

دین اسلام اپنے اس بلند و معیاری مقصد تک پہنچنے کے لئے انسانی حقوق، کرامت، آزادی اور انسان کی اجتماعی و اقتصادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت لیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بخل، غصب، حرام خوری، اسراف، بے دینی، قتل وغارت گری جیسے مہلک عناصر کی شدید مخالفت کرتا ہے اور سیاسی اور اصل شوریٰ وولایت پرعمل کر کے اور ذمہ داری کو عمومیت دے کر سیاسی اور عوامی شرکت کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

اسلام اپنے متمدن نظام اور انسانی اصول کے قیام کی راہ میں اس بات کا خواہاں ہے کہ پورے عالم

بشریت میں صلح وعدالت پرامن نظام قائم ہو جائے ۔ یہاں تک کہ اگر مجبوراً جنگ چھڑ جائے تو یہ جنگ صرف تجاوز کرنے والوں کو جواب دینے کے لئے ہوگی اور کسی بھی طرح کا نقصان بے گناہ لوگوں کو نہیں پہنچے گا، یہاں تک کہ پیڑ پودے بھی امان میں رہیں گے ۔

رسول اکرمؐ اپنے اصحاب کونصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”سِیرُوا بِسْمِ اللّٰہِ وَ بِاللّٰہِ وَ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَ عَلَی مِلَّۃِ رَسُولِ اللّٰہِ لا تَغُلُّوا وَ لا تُمَثِّلُوا وَ لا تَغْدِرُوا وَ لا تَقْتُلُوا شَیْخاً فَانِیاً وَ لا صَبِیّاً وَ لا امْرَأَۃً وَ لا تقطعُوا شَجَراً إِلَّا أَنْ تُضْطَرُّوا إِلَیْھَا ....“

(کنزل العمال: ج۴،ص،۲۲۳ و الکافی: ج۵،ص،۲۷)

خدا کے نام سے ،اور خدا کی یاد سے ،اور خدا کی راہ میں اور رسول خدا کے نقش قدم پر چلو،لوگوں کو عبرتناک سزا مت دو، حد سے مت بڑھو، اور کسی کو دھوکہ مت دو، پیچھے سے حملہ مت کرو ،بوڑھے شخص ،چھوٹے بچے اور عورتوں کو قتل مت کرو ،اور کسی درخت کو مت کاٹو یا جڑ سے مت اکھاڑو مگر یہ کہ مجبور ہو جاؤ۔

اسلام حیوانات، نباتات حتی جمادات کے لئے بھی تحفظ فراہم کرنے کا قائل ہے ”لاضرر و لاضرار فی الاسلام “ایک عمومی قانون جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ماحولیات کو نقصان پہنچانا گویا پوری بشریت کو نقصان پہنچانے کے برابر ہے لہذا اس سے منع کرتا ہے۔

اسلام نے طبیعت کو بشر کے اختیار میں دیا ہے تا کہ خدا کی نعمت کا شکر گزار رہے اور کفران نعمت نہ کرے۔

﴿وَآتاکُمْ مِنْ کُلِّ ما سَأَلْتُمُوہُ وَ إِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لا تُحْصُوھا إِنَّ الْإِنْسانَ لَظَلُومٌ کَفَّارٌ ﴾(ابراہیم آیت۳۴)

خدا نے ہر وہ چیز جسے تم نے مانگا ہے تمہیں عطا کر دی ہے، اور تم اس کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ہرگز نہیں گن سکتے اور بے شک انسان بڑا ظالم اور نعمتوں کا انکار کرنے والا ہے۔

اسلام کی نظر میں عین ممکن ہے کہ ایک مسلمان اور عالم طبیعت کے درمیان ایک جذباتی رشتہ قائم ہو جائے جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے جب پیغمبر اکرمؐ احد کے کنارے سے گزرتے تھے تو فرماتے تھے : " **هـذا جبـل احـد يحبّنا و نحبّه** " (**الصحاح**) یہ کوہ احد ہے جو ہمیں دوست رکھتا ہے اور ہم بھی اسے دوست رکھتے ہیں۔

یہ ایسا وعدہ الٰہی جو ہر مسلمان کے ذہن میں ایک مقصد کے عنوان سے موجود ہے اور وہ اسی کی طرف رواں دواں ہے:

> **"وعـد اللّٰـه الـذيـن آمـنـوا منكم و عملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الارض كـمـا استـخـلف الـذيـن ميں قبلهم و ليمكنن لهم دينهم الذى ارتـضـىٰ لهـم و ليبـدّلنّهم من بعد خوفهم امناً يعبدوننى لا يشركون بى شيئاً و من كفر بعد ذالك فاولٰيک هم الفاسقون،،**

"وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح (اچھے کام) بجالائے، انہیں خدا نے روئے زمین پر اپنا جانشین مقرر کرنے کا وعدہ کیا ہے، جس طرح ان سے پہلے والوں کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے، اور ان لوگوں کے دین کو کہ جس سے خدا راضی ہے دوسروں کے اوپر حاکم کر دیا جائے گا، اور ان کے خوف کو امن میں تبدیل کیا جائے گا تاکہ میری بندگی کریں اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں، اور اگر ان سب کے باوجود کسی نے کفر اختیار کیا تو یقیناً وہ فاسقوں کے زمرے میں سے ہوگا"۔

اسلامی معاشرہ گذشتہ ادیان کا جانشین ہے، ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اللہ کی عبادت ہوتی ہے اور ہر طرح کے اندرونی اور بیرونی دشمن سے امان میں ہے پیغمبروںؑ کا مقصد ایسے معاشرے کو تشکیل دینا ہے جو طاغوت سے دور اور خدا کی عبادت میں مشغول ہو۔

اگر انسانی منطق کو سامنے رکھتے ہوئے دہشت گردی کی تعریف یوں کی جائے کہ (ہر وہ کام جو وسیلہ اور مقصد کے اعتبار سے انسانی ضمیر سے ھماھنگ نہ ہو اور امنیت کو مختلف طریقوں سے خطرے میں ڈالے) تو ہمیں نظر آئے گا کہ اسلام اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ اس کے مقابلہ میں کھڑا ہے اور اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لئے پور کوشش کرتا ہے۔

جب تک کسی چیز کی علت اپنی جگہ پر باقی ہے تب تک اسے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے آج کل دہشت گردی

کے بہت سارے اسباب وعوامل ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

الف: جہالت ونادانی، بے جا تعصب اور دنیا کو منفی زاویہ سے دیکھنا۔

ب: محرومیت، فلاکت وغربت کا بڑھتے جانا (کاد الفقر ان یکون کفراً)

ج: ظلم وتشدد، شدت پسندی، حیوانیت وبربریت اور انسانوں سے ان کی آزادی کا چھن جانا

د: معنوی محرک کا فقدان، انسانی اقدار میں انحطاط اور حیوانی حرص وطمع کا ہونا۔

جب تک دنیا سے ان تمام علتوں کو ختم نہ کیا جائے گا دہشت گردی اسی طرح باقی رہے گی۔

ان تمام مسائل سے وسیع بڑھ کر جنگ وخونریزی، ویرانی کے خوگر بعض بڑے ممالک خود کو دہشت گردی کے خلاف جاری تحریکوں کا علمبردار سمجھتے ہیں، حالانکہ جنگ تحمیلی میں ان ممالک نے جو کہ دہشت گردی کے خلاف تھے بدترین رویہ اپنا کر اسرائیل جیسے خطرناک دہشت گرد جیسے ممالک کی حمایت کی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بین الاقوامی شخصیتوں کے ساتھ ہونے والے جلسات میں عالمی سطح پر مندرجہ ذیل مقاصد کو عملی جامہ پہنائے جانے کے خواہاں ہیں:

بین الاقوامی سطح پر ہماری تجویز:

دہشت گردی کی ہر ممکنہ صورت کو روکنے کے لئے ہم لازم سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ ہماری اس تجویز کو اپنائے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ سامراجی طاقتوں کو ہرگز یہ موقع نہ دے کہ وہ ہماری اس تجویز میں انحراف کر کے اس کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کریں اور اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لئے اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالیں۔

ایسی صورت میں اقوام متحدہ ٹیرریزم کے خلاف جاری تحریک کی علمبردار اور دنیا میں صلح وآشتی برقرار کرنے کی ذمہ دار بن سکتی ہے، ہماری نظر میں اس تحریک کی کامیابی مندرجہ ذیل موارد پر منحصر ہے۔

ا: اقوام متحدہ میں تمام ممالک کے ارکان کے حقوق اور وظایف برابر ہوں اور اس کی سلامتی کونسل کے فیصلہ پر ایک یا چند ممالک کے تسلط کو روکا جائے خصوصاً وہ غیر عادلانہ نظام جو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں لاگو ہیں جن کی وجہ سے بہت سے ممالک خاص طور پر مقبوضہ فلسطین میں دہشت گردی کی سرگرمیاں اپنے

عروج پر ہیں۔

جیسا کہ امریکی حکومت نے اس کونسل میں سینکڑوں مرتبہ ویٹو کے حق کو استعمال کر کے دہشت گرد اسرائیل کے خلاف سلامتی کونسل سے صادر ہونے والے ہر فیصلہ کو باطل کر دیا۔

۲: فلسطینی قوم اور اس کے پڑوسی دوسری اقوام پر ظلم وستم کو روکا جائے جو اسرائیلی دہشت گردی اور اس کے ظلم و بربریت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں ۔

۳: ایسا نظام مرتب کیا جائے جو خودخواہ اور مفاد پرست سامراجی طاقتوں کو لگام دے سکے تا کہ وہ نسل پرست دہشت گردوں اور ٹیرورسٹ گروہوں کی حمایت بند کریں۔

۴: غربت، جہالت، اندھی تقلید، بے جا تعصب، امراض اور ہر وہ شئے جو پس ماندگی کا سبب ہو اور آج کل کے نام نہاد تمدن کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بیماریوں سے مقابلہ کیا جائے نیز ایسے ذرائع ابلاغ کے ساتھ مقابلہ جو شدت پسندی اور قوم پرستی کو فروغ دیتے ہیں اور عالمی سطح پر اخلاقی اقدار اور معنویات کو کمزور بنانے میں مگن ہیں کیونکہ یہی وہ عوامل ہیں جو دہشت گردی کے پنپنے کے لئے فضا ہموار کرتے ہیں ۔

ایسے اہداف تک پہنچنے کے لئے مندرجہ ذیل امور سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے:

الف: مختلف ادیان اور تمدنوں کے درمیان منطقی گفتگو کو عام کرنا۔

ب: ایسی ڈیموکریسی جو انسانی اقدار کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اس کی ترویج کی جائے۔

ج: دنیا میں وسیع پیمانے پر فلاحی کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کیا جائے۔

د: بین الاقوامی اداروں کی تقویت اور ان پر مسلط سامراجی عناصر کو ہٹایا جائے۔

ھ: معنویات کی سطح کی ارتقاء اور پاکیزہ معاشرے کے قیام کے لئے دین اور گھرانے کو اہمیت دی جائے۔

و: جدید ٹیکنالوجی کو بشریت کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جائے۔

ز: انسانیت سے تناسب اور ھم آہنگی رکھنے والے ہنر کے مختلف پہلوؤں کی تقویت اور ان سے استفادہ کیا جائے ۔

۵: دینا میں رونما ہونے والے مختلف حادثات اور واقعات سے مغربی مما لک کو نا جائز فائدہ اٹھانے نہ دیا جائے ۔کبھی کبھی یہی مما لک ان حادثات کا فائدہ اٹھا کر دو تمدن ، دو ادیان ، دو مما لک یا دو اقوام کے درمیان کشمش ایجاد کرتے ہیں ۔

۶: فلسطینی اور عراقی عوام کے غموں کا مداوا ان کے لئے ضروریات زندگی کی فراہمی اور بے گانہ فوجوں کی مکمل واپسی اور عوام کی حاکمیت کی بازگشت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے ۔

۷: مختلف ادیان ،اقوام اور مما لک کی برنمایاں اور معروف شخصیات آپس میں مل بیٹھ کر گفتگو کریں تا کہ ایسے ھم آھنگ افکار سامنے آئیں جو دنیا میں صلح وعدالت کو برقرار کرنے میں مددگار ثابت ہوں ۔

جس صلح کے ہم اور بشریت خواہاں ہیں وہ ایسی عادلانہ صلح ہے جس میں مواقع سب کے لئے برابر ہوں ، ہر صاحب حق کو اپنا حق مل جائے مظلوم کے ساتھ عادلانہ رویہ رکھا جائے اور حد سے بڑھنے والے کو اس کی سزا مل جائے ، ہمارے عقیدے کے مطابق عادلانہ صلح کا برقرار ہونا ہی تنہا وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ دہشت گردی اور شدت پسندی کو روکا جا سکتا ہے لیکن اگر غیر عادلانہ طور پر صلح کسی پر تھوپی جائے تو اس کے برے نتائج ہو سکتے ہیں ۔

کیونکہ ایسی صورت میں ظالم ومظلوم برابر ہو جائیں گے انسانی حقوق پائمال ہو نگے اور نتیجہ میں پہلے سے زیادہ شدید طور پر فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی ۔لہذا غیر عادلانہ صلح سے نہ صرف یہ کہ مشکلات ختم ہونگی بلکہ پہلے سے زیادہ ان میں اضافہ ہوگا جیسا کہ ہم آج کل دنیا میں مشاہدہ کرر ہے ہیں ۔

دنیا کو مشکلات سے نجات دلانے کا ایک راستہ یہ ہے جو بالکل واضح ہے اور اس کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل موارد کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱: عوام کی شناخت اور آ گہی کی سطح کو بلند کرنا اس کے مختلف پہلو ہیں جیسے اسلام اور اسکے اہداف کی شناخت ،موجودہ صورت حال کا صحیح ادارک ،اپنے وظائف وفرائض سے آ گاہی ۔

۲: زندگی کیتمام امور میں اسلامی شریعت کا اجراء کرنے کے لئے سعی وکوشش ہو ۔

۳: اسلامی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام کے مختلف طبقات کی تربیت کرنا ۔

۴: امت اسلامی میں اتحاد و ہمدلی ایجاد کرنے کی سعی و کوشش کرنا اور ہر طرح کے خرافاتی خیالات اور سادہ لوحی سے پرہیز کرتے ہوئے حقیقت پر مبنی متعدل رویہ اختیار کرنا۔

۵: ملت اسلامیہ کی اندرونی طور پر تقویت اور انہیں سہولیات فراہم کرنے اور جدید فعال اور مفید میکانزموں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لئے عملی آزادی ہو۔

۶: دانشوروں کیلئے سیاسی، اقتصادی، تبلیغاتی، جغرافیائی، مادی، علمی، ثقافتی اور عوامی امکانات کی فراہمی اور ان سے بہترین فائدے اٹھانے کے لئے پروگرام بنانا اور جو چیلنج اس وقت ہے اس کے مقابلہ کے لئے انہیں آمادہ کرنا۔

۷: معمولی اختلاف و کشمش سے پرہیز کرتے ہوئے اصل مقاصد کی طرف توجہ اور اولویتوں کا خاص خیال رکھنا۔

۸: ان مسلمانوں کی حمایت جو دنیا کے مختلف مما لک میں مقیم ہیں اور ان کی تعداد کم ہے ایسے مسلمانوں کی تعداد، مسلمانوں کی کل تعداد کی نسبت ایک ۳/۱ ہے ان کی حمایت میں ان جوانب کا خیال رکھا جائے:

۱: موجودیت۔۲: اتحاد و وحدت۔۳: ان کا تشخص اور امت اسلامی سے ان کے روابط کے لئے مناسب زمینہ فراہم کرنا

۹: فلاحی، امدادی اور تبلیغاتی انجمنوں کی حمایت پر تاکید اور دائمی طور پر ان کی حمایت، اسی طرح انہیں آپس میں غیر ضروری باتوں پر اختلافات ایجاد کرنے سے روکنا۔

۱۰: تعلیمی اداروں میں آزادی اور ان کے استقلال کا تحفظ تا کہ کسی سے مرغوب ہوئے بغیر اپنا کام صحیح طریقے سے انجام دیں۔

۱۱: عالمی سطح کے غیر سرکاری اداروں کو اپنے عادلانہ مفادات تک رسائی کے لئے صحیح طور پر استعمال کرنا۔

۱۲: بشریت کے سرنوشت ساز مسائل کے حل کے لئے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہونا، ان مسائل میں سب سے اہم فلسطین کا مسئلہ ہے۔

اس سلسلے میں ہم مواد ذیل کو تجویز کے طور پر پیش کرتے ہیں:

۱: تمام اسلامی اقوام کو شارون کے پروگرام کو ناکام بنانے کے لئے تیار کرنا، شارون کا پروگرام یہ ہے کہ فلسطینی قوم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اس شجاع اور پائدار قوم کی مقاومت کی بھرپور حمایت کے ذریعہ انتفاضہ

کو ختم کیا جائے۔

۲: آوارہ ہو جانے والے فلسطینیوں کی مدد اوران کے منہدم ہو چکے مکانات کی تعمیر نو کے لئے امکانات اور سہولیات فراہم کرنا اور سرمایہ دار ممالک سے ان اجراجات کی فراہمی کے لئے درخواست کرنا۔

۳: اس بات پر تاکید کہ فلسطین کا مسئلہ عالم اسلام کا مسئلہ ہے اور پورے عالم میں اسلام کے تمام تر امکانات کو اس کے حل کے لئے استعمال کرنا۔

۴: اسرائیلی سفاکیت اور ظلم و بربریت کو ختم کرنے کے لئے تمام بین الاقوامی محافل اور قانونی امکانات سے استفادہ کرنا۔

۵: امریکہ کو مسئلہ فلسطین میں مداخلت کی اجازت نہ دینا اور اس مسئلہ کے حل کے لئے امریکہ کی جانب سے پیش ہونے والی تجاویز پر عدم اعتماد ظاہر کرنا۔

۶: غاصب اسرائیلی حکومت اور اس کے حامیوں کا بائیکاٹ کرنے کے لئے سنجیدہ پروگرام بنانا اور ان کا عوامی بائکاٹ کرنا۔

۷: اس سلسلہ میں اسلامی کانفرنس کے سیاسی کردار کو فعال کرنا، خصوصاً فلسطینیوں کے حقوق کے مطالبہ کے لئے بین الاقوامی قوانین کا سہارا لینا۔

۸: دانشوروں کا دہشت گردی کی صحیح تعریف کو پیش کرنا اور دہشت گردی اور جائز مقاومت کے درمیان فرق کو واضح کرنا۔

۹: فلسطینی قوم کی قانونی مقاومت کو تحفظ دینا۔

۱۰: عالمی سطح کے غیر سرکاری اداروں سے مدد حاصل کرنا، مثلاً جنوبی افریقہ میں موجود ''ڈربن'' کانفرنس سے تعاون طلب کرنا۔

آخر میں ہم تاکید کے طور پر چند نکات ذکر کرتے ہیں:

وہ اسلامی تمدن کہ جسے قرآن کریم اور سنت پیغمبرؐ نے بطور ہدیہ پیش کیا ہے چند مندرجہ ذیل نمونے ذکر کئے جارہے ہیں:

الف: تمام ادیان کے پیشواؤں کے ساتھ گفتگو کرنا اور غیر مسلموں یہاں تک کہ مشرکوں کے احترام کا تحفظ کرنا۔

ب: دینی، مذہبی اور ثقافتی کثرت کو قبول کرنا۔

ج: ایسی جنگ نہ ہو جس میں بڑے پیمانہ پر تباہی اور وسیع قتل عام ہو ۔

داخلی اور بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں کو قبول کی جائے۔

د: دوسروں کے عبادی اور مذہبی مقامات کا احترام کرنا۔

ھ: مستضعف، محروم اور بھوکے افراد کی حمایت کی بھرپور کوشش کرنا۔

و: معتدل رویہ اپنانا اور کسی طرح کی شدت پسندی سے پرہیز کرنا۔

ز: مدمقابل کا احترام، گفتگو کرنے والوں کے درمیان متناسب تحفظ اور علمی اسلوبوں کی پیروی کرنا، علمی انسانی اور اصولی شیوؤں پر مبنی گفتگو کا انعقاد اور مورد اختلاف نقطہ نظر کی صحیح تشخیص کے بعد اختلاف کو دور کرنا۔

قوم کے ہر فرد کے لئے رہبر کے انتخاب اور اپنے مقدرات کا فیصلہ کرنے کے سلسلہ میں مکمل آزادی کا قائل ہونا چاہے حاکم اور عوام میں مذہبی اختلاف ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو۔

صلح کی ترقی اور پرامن طریقوں کی حمایت حتی سازشوں کی فرضیہ کی صورت میں۔

علم و دانش کے درپے رہنا اور ہر جگہ اور ہر حال میں تمام قوموں کے ساتھ تمدنی تبادلہ خیال کرنا۔

تمام اقدار، ایثار و قربانی، تعاون، تسامح اور بخشش کی فضا کو فروغ دینا۔

ایسا منطقی اور شائستہ تمدن قطعاً اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس پر تہمتیں لگائی جائیں اور وہ بھی شدت پسندی، ٹیررزم اور خوف و ہراس کو فروغ دینے کا گھناؤنا الزام اس پر عائد کیا جائے۔ اس کے خلاف صلیبی جنگیں چھیڑی جائیں اور اس کی تعلیمات میں شکوک و شبہات ایجاد کریں اس کے خلاف ثقافتی یلغار شروع کر کے اس کی شفاف تصویر کو دھندلا کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جائے۔

آزادی بیان دینی تعلیمات اور
انسانی حقوق کے تناظر میں

سید مصطفیٰ میر محمدی (دانشگاہ مفید کی علمی کمیٹی کے ممبر محقق ومؤلف)
ترجمہ: سید احتشام رضا نقوی

خلاصہ:

حق ''آزادی بیان'' انسان کے سیاسی و مدنی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے جس کی تائید اور حوصلہ افزائی اسلامی تعلیمات میں بھی کی گئی ہے یہ اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین اور بہت سی بین الاقوامی اسناد میں قبول شدہ حق ہے۔ زیر نظر مضمون میں پہلے ''آزادی بیان'' کی اہمیت اور تعریف کو بیان کیا گیا ہے پھر آزادی کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کا دو مرحلوں میں جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے مرحلہ میں تعقل، تدبر، بہترین گفتگو، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، مشورہ، حکمرانوں کو نصیحت اور ان کے اعمال پر تنقید کو اسلام میں آزادی بیان کے موید اصولوں میں شمار کیا گیا ہے جبکہ دوسرے مرحلہ میں اس سلسلہ میں دینی رہنماؤں کی عملی سیرت کے بعض نمونوں کو دلائل کے طور پر لایا گیا ہے۔

﴿الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمه البیان﴾ [1]

''وہ خدا مہربان ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے انسان کو پیدا کیا ہے اور اسے بیان سکھایا ہے''

پیش لفظ

خالق کائنات نے اپنی حکیمانہ مشیت سے انسان کو ایسا بنایا ہے جو سوچتا اور بولتا ہے تفکر و تکلم جیسی دو عظیم نعمتیں خداوند عالم نے انسانوں کو دیں اور اس کے لوازمات کو طبیعتاً ان کے وجود میں رکھ دیا ان دو گرانقدر نعمتوں کے پرتو میں

خداوند عالم نے نوع بشر کو دیگر موجودات پر برتری بخشی اور اس کو ان سب سے ممتاز بنا دیا۔

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ﴾ ۔۲

''اور ہم نے بنی آدمی کو کرامت عطا کی ہے اور انہیں خشکی اور دریاؤں میں سواریوں پر اٹھایا ہے اور انہیں پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سوں پر فضیلت دی ہے۔''

خالق کلام انسان، کلام کو خلق کر کے اپنی افکار اور سوچ کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے اور ان کو اپنے مقصود سے آگاہ کر سکتا ہے انسان اپنی سیاسی، اجتماعی، اقتصادی، ثقافتی اور اعتقادی خواہشات۔ جن کا دوسرے کو علم نہیں، کو زبان، قلم، تصویر یا کسی دوسرے ذریعہ سے دوسروں کے اختیار میں دے سکتا ہے یہ وہی نعمت بیان ہے جسکو قرآن نے ذکر کیا ہے۔۳

بحث کی اہمیت، تعریف اور حد بندی:

''حق آزادی بیان، انسان کی بنیادی آزادیوں میں سے ایک ہے جس کو عالمی منشور برائے انسانی حقوق اور بین الاقوامی معاہدوں میں قانونی حیثیت حاصل ہے۔ یہ حق، سیاسی مدنی آزادیوں اور انسانی حقوق کی نسل اول میں شمار کیا جاتا ہے اور اس طرح کے حقوق میں حکومتوں کے معاہدے، نتیجہ کے معاہدات میں سے ہیں'' ۴ یعنی مربوط تعہدات کی رکنیت رکھنے والی حکومتیں متعہد ہیں کہ موجود امکانات یا معاشرے پر حاکم شرایط اور اوضاع واحوال کو ملاحظہ کئے بغیر ان حقوق کے نفاذ کی ضمانت دیں اور انکو محترم سمجھیں عالمی منشور برائے انسانی حقوق کی ۱۹۴۸ء میں پاس ہونے والی دفعہ نمبر ۱۹ کہتی ہے:

''ہر شخص عقیدہ و بیان میں آزادی کا حق رکھتا ہے اس حق کا لازمہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے عقیدہ کے سلسلہ میں خوف و ہراس نہ رکھے اور ہر ممکن وسیلہ سے کسی حدود کا خیال کئے بغیر معلومات وافکار کو کسب و دریافت کرنے نیز شائع کرنے میں آزاد ہو''

اگرچہ عالمی منشور برائے انسانی حقوق ایک ''اعلامیہ'' کی صورت میں ہے لیکن اسکے بعد متعدد بین الاقوامی اسناد اور اقوام متحدہ کے عام اجلاس میں پاس ہونے والی قراردادوں میں اس کی تائید نے اسکے مفاد کو رائج بین الاقوامی حقوق میں بدل دیا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں پاس ہونے والے مدنی وسیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدوں کی

۱۹ ویں دفعہ میں دوسرے بند جسکو ۱۳۴۷ ہجری شمسی میں حکومت ایران نے اور ۱۳۵۴ ہجری شمسی میں ایرانی پارلیمنٹ نے پاس کیا ہے میں آیا ہے:

''ہر شخص بغیر کسی ملاحظہ کے عقیدہ و بیان میں آزادی کا حق رکھتا ہے یہ حق کسی حد کا خیال رکھے بغیر معلومات و افکار کی جستجو کرنے، حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے پر مشتمل ہے خواہ وہ زبانی ہو یا تحریری، چھپا ہوا ہو یا آرٹ کی صورت میں ہو''

اس نکتہ کے مدنظر کہ ایرانی حکومت اس معاہدے کی رکن ہے نیز ایران کے مدنی آئین کی نویں دفعہ کا لحاظ کرتے ہوئے جو کہ کہتی ہے:

''آئین کے مطابق ایرانی حکومت اور دیگر حکومتوں کے درمیان ہونے والے معاہدے قانون کے حکم میں ہیں''

مذکورہ معاہدے عام قوانین کے حکم میں ہیں اور باقی قوانین کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایران کے موضوعی حقوق کا جز شمار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ایرانی حقوق، مذہبی حقوق ہیں اور آئین کی چوتھی دفعہ کے مطابق تمام قوانین کو اسلامی معیارات کے مطابق ہونا چاہئے اس بنیاد پر اسلامی تعلیمات کے تناظر میں حق آزادی بیان کی بحث، ایرانی نظام حقوق میں علمی وحقوقی حقیقت کے مطابق ہے۔ اب آزادی بیان کی تعریف کی جاتی ہے۔

آزادی بیان کی چند تعریفیں کی گئی ہیں:

۱۔ آزادی بیان ۵ یعنی لوگ، حکومت کی مداخلت کے خوف کے بغیر عقیدہ کو بیان کرنے اور نطق وخطابت میں آزاد ہیں۔ ۶

۲۔ آزادی بیان ۷ یعنی اپنی رائے، عقیدہ اور احساس کا زبانی، تحریری، تصویری یا کسی اور شکل میں اظہار کرنا۔ ۸

پہلی تعریف، آزادی بیان کی تعریف خاص ہے جس میں آزادی کلام کی آزادئ بیان کی بیان کے واضح اور غالب آزادی کے نمونہ کے عنوان سے تعریف کی گئی ہے جبکہ دوسری تعریف آزادی بیان کی تعریف عام ہے اور اس مضمون میں یہی دوسری تعریف مدنظر ہے۔

''ہمارے (ایران کے) موجودہ معاشرے میں یہ آزادی، کتاب اور مقالہ لکھنے، مجلّہ اور روزنامہ شائع کرنے، تقریر، کانفرس، وبلاگ اور ٹی وی نیز ریڈیو کے پروگراموں کو ترتیب دینے کی شکل میں متحقق ہوتی ہے، آئین کی دفعہ نمبر ۲۴ جو یہ کہتی ہے کہ:

نشریات اور پریس بیان مطالب میں آزاد ہیں مگر یہ کہ اسلام کے اصولوں یا عام حقوق میں مخل ہوں...،اگر چہ آزادی بیان کے بعض مصادیق کو بیان کر رہی ہے لیکن مجموعی طور پر اسکو آزادی بیان کی اصل کا اعلان سمجھا جا سکتا ہے [۹] اس حق کا ذکر آئین کی دفعہ نمبر ۱۷۵ میں بھی ہوا ہے:

''اسلامی جمہوریہ ایران کے ٹی وی اور ریڈیو میں اسلامی معیارات اور ملکی مفادات کا لحاظ رکھتے ہوئے افکار کو بیان اور نشر کرنے کی آزادی ہونا چاہئے''

آزادی بیان کے سلسلہ میں بہت سی باتیں ہیں اور مختلف زاویوں سے اسکو مورد بحث و مطالعہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس مضمون کا ہدف یہ بتانا ہے کہ اسلام کی حیات بخش تعلیمات میں آزادی بیان کے حق کی نہایت بہترین انداز میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

اس تحقیق میں یہ منظور نظر نہیں ہے کہ جو کچھ عالمی منشور برائے حقوق بشر میں آیا ہے وہ شریعت اسلام سے سازگاری رکھتا ہے یا نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام میں ایک دین و شریعت کے عنوان سے عالمی منشور اور انسانی حقوق کی اسناد کے آنے سے پہلے آزادیوں منجملہ آزادی بیان کی بطور شایستہ حمایت و تائید کی گئی ہے۔

مسلمان فقہا اور حقوق دانوں نے اسلامی منابع و مصادر سے استفادہ کرتے ہوئے جن ضوابط اور اصولوں کو ہمارے اختیار میں قرار دیا ہے وہ ہمارے بہت سے مباحث منجملہ آزادی بیان کے رہنما اصول ہیں۔ یاد رہے کہ مغرب میں آزادی بیان و عقیدہ کی بحث کا تاریخی پس منظر زیادہ تر اس فضا اور شرایط سے متاثر تھا جسکو گرجا گھر نے انسانی معاشروں پر حاکم کر رکھا تھا اور ان سے رہائی آزادیوں کی ایسی تعریف کے سوا میسر نہیں تھی، لیکن اسلام میں متعدد اصولوں نے اس حق بلکہ بعض موارد میں اس فریضہ کو قائم کر رکھا ہے، دینی رہنماؤں کا قول و فعل بھی آزادی بیان کا موید ہے، ہم ان مطالب کو دو مرحلہ میں بیان کر رہے ہیں:

مرحلہ اول: اسلام میں آزادی بیان کے اصول

اسلام میں آزادی بیان کے استحکام کی تائید کرنے والی چیزیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ تعقل، تدبر اور تفکر کی دعوت

بے شک تفکر کو اسلام میں بلند مقام حاصل ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیتیں تعقل، تفقہ اور بہترین طریقے سے گفتگو کرنے کے سلسلہ میں ہیں جن میں سے ہر آیت آزادی بیان کا واضح نمونہ شمار ہوتی ہے۔

فکر اس وقت شکوفا ہوتی ہے جب اسکو پیش کیا جا سکے، تدبر اس وقت مفید ہے جب نئی فکریں اس کی

زمین کو ہموار کریں، تفقہ (دین میں تحقیق وجستجو) اس کے وسائل کے بغیر کیسے انجام پا سکتا ہے؟

بے شک کلام کی تخلیق نیز کتاب، تالیف، حدیث اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی صورت میں بشری و الٰہی منابع تفقہ کے مہم ترین وسائل ہیں۔

قرآن مجید، مخالفین سے روبرو ہوتے وقت ان کو اپنے دلائل بیان کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ ۱؎ جو بہترین باتوں کی اتباع کرتے ہیں، بندگی خدا کی بشارت پاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے۔ انہیں صحیح راستہ کی نشاندہی کی ہے۔ یہ صاحبان عقل وفکر ہیں:

﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِى الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللهُ وَأُوْلَئِكَ هُمْ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ ﴾ ۱؎

''لہٰذا اے پیغمبر آپ میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے جو باتوں کو سنتے ہے اور جو بات اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت دی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو صاحبان عقل ہے ''

واضح سی بات ہے کہ بحث ''سننے'' سے نہیں ہے بلکہ ''سننا'' بہترین باتوں کو انتخاب کرنے اور ان کا اتباع کرنے کا راستہ ہے۔

بندگان خدا اسی وقت ''قول احسن'' کو منتخب کر سکتے ہیں جب قول حسن یا اس سے پست تر پیش ہو سکے اور اس طرح کا ماحول بنانا آزادی بیان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول ''انظر الیٰ ما قال ولا تنظر الی من قال'' بھی اسی تناظر میں ہے کہ بہت سی باتوں میں سے بہترین اور صحیح بات کا انتخاب کیا جائے نہ کہ دیکھا جائے کہ کہنے والا کون ہے اور کس پوزیشن میں ہے چہ بسا متکلم کی سیاسی اور اجتماعی پوزیشن اور اس کی دوستی ودشمنی باتوں کی ترجیح وعدم ترجیح میں موثر ہو جائے دوسرے الفاظ میں اس مشہور جملہ ''کلام الملوک ملوک الکلام''، کو کوئی مقام واہمیت حاصل نہیں ہے۔

احتجاج کے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے آثار رہبران دینی کے اپنے ہمعصر مخالفوں کے ساتھ منطقی وعلمی بحثوں کا ایک نمونہ ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے علمی مباحثات پر مشتمل کتاب ''الاحتجاج'' کے مولف طبرسی اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں اس کو تدوین کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے اس طرح لکھتے ہیں: جس چیز نے مجھے اس کتاب کو لکھنے پر ابھارا وہ یہ ہے کہ ہمارے ہمعصر بعض

علماء نے استدلال اور مناظرہ سے پرہیز کیا اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے کبھی مناظرہ نہیں کیا اور اس کو اپنے پیروؤں کے لئے جائز نہیں سمجھا۔ میں نے مناسب جانا کہ ایک ایسی کتاب کی جمع آوری کروں جس میں دینی رہنماؤں کے مخالفوں کے ساتھ استدلالات، مناظرات اور حق باتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہو۔ ہاں جہاں ائمہ علیہم السلام نے بعض افراد کو مناظرہ سے منع کیا ہے وہ ایسے افراد ہیں جو علم نہیں رکھتے اور مقاصد دین کو بیان کرنے میں ناتواں ہیں۔[۱۲]

اس بنیاد پر اگر احتجاج نامی آثار کو آزادی بیان کے حق کا اہم تاریخی مدرک سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا اس لئے کہ اس میں مخالفین نے کسی خوف کے بغیر اپنے عقائد و نظریات کو پیش کیا ہے اور گفتگو کی ہے۔

۲۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

مسلمانوں کے نزدیک محکم اصولوں میں جس کی تاکید قرآن مجید کی بہت سی آیات کرتی ہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسی اصل ہے، قرآن مسلمانوں کو ایک ایسا گروہ سمجھتا ہے جو ایک دوسرے کو نیکی کی دعوت دیتے ہیں اور غلط باتوں سے روکتے ہیں۔

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنْ الْمُنْكَرِ﴾[۱۳]

"اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہے جو خیر کی دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے روکے اور یہی لوگ نجات یافتہ ہیں"

اسلام میں افراد کی ذمہ داری حکومتی کارندوں سے الگ نہیں ہے اگر حکومتیں معاشرہ کو چلاتی ہیں تو لوگ بھی اسی معاشرہ کا حصہ ہیں۔ حکومتی کارندوں پر لوگوں کی نگرانی ایسے موارد میں ہے جو دینی رہنماؤں کی حکومتی سیرت میں موجود رہی ہے اور مسلمان خصوصاً صدر اسلام میں حکومت کے مقابلے میں احساس ذمہ داری کرتے نیز حکمرانوں کے اعمال پر نگرانی کو اپنا حق تصور کرتے تھے (کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته)

امام علی علیہ السلام اپنی اولاد کو وصیت میں فرماتے ہیں:

"لاتترکوا الامر بالمعروف والنهی عن المنکر فیولی علیکم شرارکم ثم تدعون فلا یستجاب لکم"[۱۴]

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرنا ورنہ بدکار تم پر مسلط ہو جائیں گے پھر دعا

مانگو گے تو قبول نہ ہوگی‘‘

آزادی بیان کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے رابطہ کے سلسلہ میں قابل ذکر حق فریضہ کا رابطہ ہے یعنی آزادی بیان حق محسوب ہوتا ہے لیکن امر بالمعروف ونہی عن المنکر فریضہ۔لہٰذا کس رابطے کی وجہ سے امر بالمعروف آزادی بیان کے اصولوں میں شمار ہوتا ہے؟

جواب: اس فریضہ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) میں دو رابطے پائے جاتے ہیں جنکو ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری ہے۔ پہلا رابطہ اشخاص کے درمیان ہے جس میں قانون کے نفاذ، اخلاق کی حمایت اور اجتماعی و اعتقادی ہمبستگی کو ہدف قرار دیا جاتا ہے جبکہ دوسرا رابطہ حکومت اور لوگوں کے درمیان ہے جسکا نتیجہ حکومت کی طرف سے ارشاد وراہنمائی اور لوگوں کی طرف سے نظارت اور غلط راستے سے روکنا ہے۔

دوسرے رابطہ میں اس وقت حق آزادی بیان کی ضرورت کا زیادہ احساس ہوتا ہے جب کوئی شخص رائج اور قدرت وحکومت پر تکیہ کئے ہوئے افکار کے مقابل زبان کھول کر تنقید کرنا چاہے۔واضح ہے کہ حکومت کی ثنا وتمجید حمایت کی محتاج نہیں ہے بلکہ وہ کلام حمایت کا محتاج ہے جو طاقت کی رکاوٹ سے روبرو ہو۔آزادی بیان اس وقت بیرونی مشکل اختیار کرتی ہے جب طاقت کی رکاوٹ کے مقابلے میں استعمال ہولہذا آزادی بیان کے وقوع پذیر ہونے کا لازمہ فریضہ اور تفکر (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو بیان کرنے کی ضرورت کومحسوس کرنا ہے ۔[۱۵]

مسلمان نہ صرف یہ کہ آزادی بیان کا حق رکھتا ہے بلکہ مکلّف ہے کہ اس آزادی کو استعمال کرے۔ مسلمان کو چاہئے کہ ظلم وستم اور تجاوز کے مقابلے میں کھڑا ہو اور انکے انجام دینے والوں کو انکی اجتماعی، انسانی اور دینی تکالیف کی طرف ترغیب دلائے۔واضح ہے کہ مسلمان اس وقت حکمرانوں کو برائی سے روک سکتا ہے جب فکر ونظریہ کے بیان میں آزاد ہو۔یہی سبب ہے کہ ۱۹۹۰ء میں اسلامی کانفرنس کے رکن ممالک کے وزراء خارجہ کے ذریعہ پاس ہونے والے ''قاہرہ اعلامیہ'' کی بائیسویں دفعہ میں حق آزادی بیان کے ساتھ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے: الف) ہر انسان اپنی رائے اور نظر کو اس طرح سے جو شرعی اصول سے مغایرت نہ رکھتی ہو بیان کرنے میں آزاد ہے۔ب) ہر انسان ضوابط شریعت کے مطابق دوسرے کو خیر کی دعوت دے سکتا ہے اور برائی سے روک سکتا ہے۔

یہ داستان مشہور ہے کہ خلیفہ دوم حالانکہ سختی میں مشہور تھے اور لوگ ان سے ڈرتے تھے پھر بھی انھوں نے آغاز خلافت میں لوگوں سے اپنی باتوں کے درمیان کہا: اگر میں حق وعدالت کے راستہ سے منحرف ہو جاؤں تو مجھے صحیح راستہ پر لے آنا۔ایک عام آدمی نے اپنی شمشیر پر ہاتھ رکھا اور چلا کر کہا: اگر تم سیدھے نہیں ہوئے تو ہم اس ٹیڑھی

تلوار سے تم کو سیدھا کر دیں گا۔ کسی نے اس مجمع میں اس کو کچھ نہ کہا اور عتاب نہ کیا خلیفہ نے بھی نہ فقط یہ کہ اس پر سختی نہیں کی بلکہ کہا: خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی ہے جو اسے راہ راست پر لے آئے۔ صدر مملکت اور عام آدمی کے درمیان اس طرح کی علنی اور براہ راست گفتگو ڈیموکریسی اور آزادی بیان کی نہایت خوبصورت تصویر ہے جسکو اسلامی تعلیمات نے ایک طولانی سابقہ کے ساتھ ہمیں تحفتا پیش کیا ہے۔ ۱۶

۳۔ مشورہ

انفرادی، اجتماعی اور سیاسی امور میں اسلام نے جن اصولوں پر توجہ دی ہے ان میں سے ایک مشورہ کرنا ہے جسکا منطقی و طبیعی لازمہ آزادی بیان ہے قرآن کریم رسول اسلام ﷺ کو انصار و اصحاب سے مشورہ کرنے کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے:

" وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ " ۱۷: اور ان سے امر جنگ میں مشورہ کرو بعض معاصر فقہاء کی نظر میں یہ آیت چند برجستہ نکات کی حامل ہے:

۱۔ خود پیغمبر ﷺ امت کے سیاسی رہنما کے عنوان سے اس حکم خداوندی کے مخاطب ہیں اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کے تین پہلو ہیں:

اول: شخص حقیقی اور معاشرہ کی ایک نمایاں شخصیت آپ کے منصب کو مدنظر رکھے بغیر

دوم: صاحب مقام نبوت و شریعت

سوم: معاشرے کے سیاسی رہنما

اس آیت میں آنحضرت کی شخصیت کا تیسرا پہلو مورد خطاب ہے اور آپ موظف ہیں کہ لوگوں سے مشورہ کریں۔

۲۔ ''شاورھم''، میں موجود ضمیر کا مرجع لوگ ہیں جن سے مشورہ کیا جانا چاہئے اور یہ مشورہ براہ راست یا بالواسطہ ہو۔

۳۔ سیاق کے قرینہ سے پتہ چلتا ہے کہ ''امر'' سے مراد عام سیاست گذاری ہے، اس لئے کہ جب پیغمبر اکرمؐ کی سیاسی شخصیت مخاطب ہے تو فریضہ کا موضوع بھی سیاست گذاری سے مربوط ہوگا۔ ۱۸

واضح ہے کہ اگر لوگ براہ راست یا اپنے نمایندوں کے ذریعہ بالواسطہ طور پر اپنے نظریات کو بیان نہ کر سکیں تو مشورہ کا موضوع اور مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ مشورہ اس وقت حقیقی ہوگا جب حاکم کی طاقت کے خوف کے

بغیر بیان ہو لہٰذا قرآنی قانون مشورہ کے نفاذ کی ضمانت اس وقت کی جا سکتی ہے جب آزادی بیان کو باقاعدہ قبول کر لیا جائے۔

۴۔ مسلمان حکمرانوں کو نصیحت کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا حق:

تنقید کا حق، حق آزادی بیان کے واضح نمونوں میں ایک نمونہ ہے یہ حق تمام شہریوں کیلئے محفوظ ہے اور ہر شخص ملک کے مختلف سیاسی اداروں پر تنقید کر سکتا ہے۔ اس حق کو عملاً قبول کرنا حکمرانوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ لوگوں اور معاشرہ کے عقلاء کی تیز بین نگاہوں سے بچنے کیلئے اس طرح عمل کریں کہ کم سے کم تنقید کا نشانہ بنیں۔

تاریخ میں آیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مسجد میں تشریف لائے اور اپنی آخری تقریر کی ضمن میں اپنے بعد کے حاکم و والی سے اس طرح فرمایا:

''... ولم يغلق بابه فيأكل قولهم ضعيفهم...'' [۱۹]

''۔۔۔ وہ لوگوں پر اپنا دروازہ بند نہ کرے کہ طاقتور ضعفاء کو کھا جائیں''

امام علی علیہ السلام اپنی حکومت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''اے لوگو! میرا تمھارے اوپر اور تمھارا میرے اوپر حق ہے۔ تمھارا میرے اوپر یہ حق ہے کہ میں تمھاری خیر خواہی سے دریغ نہ کروں اور میرا تمھارے اوپر یہ حق ہے کہ بیعت میں وفادار رہو اور ظاہر و باطن میں خیر خواہی و نصیحت کرنا نہ چھوڑو'' [۲۰]

امام صادق علیہ السلام کی نگاہ میں بھی دوستوں کی طرف سے عیوب کا ذکر کرنا بہترین ہدیہ ہے چنانچہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

''احب اخوانی من اهدی الی عیوبی'' [۲۱]

''میرا محبوب ترین بھائی وہ ہے جو میرے عیوب مجھے بتائے''

''حاکم کی طرف سے حق تنقید کو مان لینے میں اسی کا فائدہ ہے اس لئے کہ اس صورت میں قوانین کی پابندی کے اظہار کے علاوہ اپنی حکومت کو مستقبل میں قانون شکنی کی آفات سے بچا سکتا ہے، راہ تنقید کو بند کرنے کا نتیجہ مستقبل میں بے عدالتی اور قانون شکنی کا سخت تاوان دینا ہے۔ تنقید کا سب سے بڑا فائدہ معلومات فراہم کرنا ہے کوئی بھی حکومت معلومات حاصل کرنے سے بے نیاز نہیں ہے مثلاً اگر معاشرہ میں کچھ ناراضگی وجود میں آجائے اور اسکی خبر صاحب منصب لوگوں تک نہ پہنچے یا ناقص پہنچے تو مستقبل میں اس طرح کی سیاست کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صاحبان منصب افراد معاشرہ کے حقائق سے لاعلم ہو جائیں گے۔ تنقید اگر چہ کڑوی ہو مفید ہے۔ اگر کوئی حکومت کسی بھی وجہ

سے لوگوں کی تنقید سے حاصل ہونے والی معلومات سے اپنے کو بے نیاز سمجھے، تب بھی تنقید کے کردار سے صرف نظر نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی بھی وجہ سے خواہ حق ہو یا ناحق کسی پر تنقید کرتا ہے اور اسکو زبان پر لاتا ہے تو اسکو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہلکا ہو گیا ہے لیکن اگر دل کی بات نہ کہہ سکے تو وہ ایک کینہ بن جاتا ہے اور وہ دوسری صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے جو غالباً پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔۲۲

''مسلمان حکمرانوں کو نصیحت'' بھی ایک باب ہے جو اسلام کی سیاسی فقہ میں کھولا گیا ہے ۔۲۳ کتاب کافی میں'' النصیحة لائمه المسلمین '' کے باب میں آیا ہے کہ رسول گرامی اسلام ﷺ نے سرزمین منا کی مسجد خیف اور مراسم حج میں لوگوں کے درمیان فرمایا: خدا مدد کرے اس شخص کی جو میری باتوں کو سنے، انکو حفظ کرے اور نہ سننے والوں تک پہنچائے ... مرد مسلمان کا دل تین چیزوں میں کینہ و خیانت نہیں کرتا: خدا کیلئے عمل خالص، مسلمان حکمرانوں کو نصیحت اور اسلامی معاشرہ کو محکم کرنا۔۲۴

واضح ہے کہ یہاں پر نصیحت سے مراد موعظہ نہیں ہے۔ یہ کام تو ہر سن رسیدہ عورت اور مرد آسانی سے کرسکتے ہیں بلکہ نصیحت یعنی حاکم کی خیرخواہی اور اسکو صحیح راستے کی نشاندہی ہے۔ ''نصیحت'' میں مقصد یہ ہے کہ جو کچھ ایک قوم کی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے حقائق کا تقاضا ہے اسکو بغیر کسی خوف و ہراس کے صاحبان قدرت و حکومت تک منتقل کیا جائے فارسی زبان میں نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اس چیز کی طرف دعوت دی جائے جس میں اس کی صلاح ہے اور اس سے اسے روکا جائے جس میں اس کی خرابی ہے ۔۲۵

''حاکم یا عادل اور قانونی ہے یا ظالم و غیر قانونی۔ دوسرے فرض میں دوسروں کے حقوق کا دفاع اور مظلوموں کی فریادرسی'' افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر ''۲۶ کا مصداق ہوگا جس میں ہر مسلمان اپنی طاقت بھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب سے حاکم کو دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے پر آمادہ کرے گا اور جہاں حاکم عادل اور قانونی ہے'' النصیحة لائمه المسلمین '' اس کے شامل حال ہے۔ اگرچہ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ نصیحت ہر طرح کے حاکم کو شامل ہے چاہے عادل ہو یا جابر و ظالم''۔۲۷

''آج بین الاقوامی معاشرے میں انسان اپنے مطالبات میں اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ انفرادی یا اجتماعی شکل میں حکومتی عہدیداروں کی سیاستوں اور ان کے اعمال کی، انسانی حقوق اور سیاسی آزادیوں کی پامالی کے سلسلے میں، عدالتی اور قانونی حقوقی نظام میں ہر باصلاحیت منصب دار کو شکایت نامہ پیش کرے یا دوسری مناسب روشوں کے ذریعہ شکایت کرے اور مذکورہ عہدہ دار کو چاہیئے کہ بلاتاخیر ان

شکایات کے سلسلہ میں اپنا فیصلہ سنائے'' ۲۸

اگر چہ یہ حق ایک اعلانیہ کی صورت میں بیان ہوا ہے اور اس پر عمل کرنا حکومتوں کے لئے لازم نہیں ہوتا لیکن دوسری جانب یہ حکومت و رعایا کے درمیان رابطے کے سلسلے میں ایسے مطالبات کی خبر دیتا ہے حالانکہ مسلمان سیکڑوں سال قبل تعلیمات اسلامی اور دینی رہنماؤں کے کردار و رفتار کے سائے میں یہ جانتے تھے کہ ان کو یہ حق حاصل ہے بلکہ بعض مورد میں وہ مکلّف ہیں کہ اپنے حکمرانوں کے اعمال پر بغیر کسی خوف کے تنقید کریں۔ یہ اسلامی حکومت کا ایک امتیاز ہے، ہم یہاں پر اس سلسلہ میں دینی رہنماؤں کی سیرت کے بعض نمونے بیان کر رہے ہیں۔

مرحلہ دوم: دینی رہنماؤں کی سیرت اور آزادی بیان:

دینی رہنماؤں کی حیات طیبہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ فقط قول بلکہ عمل سے بھی اس حد تک کہ عمومی نظم اور معاشرتی اخلاق کیلئے مضر نہ ہو، مخالف افکار کے مقابل آزادی بیان کی رعایت اور ترغیب فرماتے تھے۔

مدینہ میں حکومت اسلامی کے بانی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت یہ تھی کہ آپ صاحبان حق کو اجازت دیتے تھے کہ بغیر کسی خوف و ہراس کے اپنی بات بیان کریں، اپنی تنقید اور اعتراض کو زبان پر لائیں اور حاکم کے روبرو آنکھ کان بند کر کے عمل نہ کریں۔

خداوند عالم اپنے نبیؐ کو ایک مہربان، خوشدل اور عوامی شخصیت کے عنوان سے پہچنواتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ ۲۹

''اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے''

وسعت قلب، کشادہ روئی اور کریمانہ اخلاق اس قاصدِ وحی کی کامیابی کا اہم سبب تھا یہاں ہم پیغمبر ﷺ کی مدنی زندگی کے بعض نمونے پیش کر رہے ہیں اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے وہاں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اور مقام نبوت کے علاوہ صاحب اقتدار و حکومت بھی ہوئے۔

اسلامی مورخین لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ وفات سے تین روز قبل مسجد میں آئے اور آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا: جس کا بھی میرے اوپر کوئی حق ہے کھڑا ہو اور اپنا حق لے لے اس لئے کہ اس دنیا میں قصاص، روز قیامت کے قصاص سے آسان ہے۔

اس موقع پر سوادہ بن قیس نامی شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: جب آپ ﷺ جنگ طائف سے پلٹ رہے تھے تو آپ ﷺ نے مرکب کو مارنے کے لئے اپنا تازیانہ اٹھایا لیکن اتفاق سے وہ تازیانہ میرے پیٹ پر لگ گیا

اور میں اب اس کا قصاص لینے کیلئے آمادہ ہوں۔ پیغمبر ﷺ کا یہ اعلان صرف ایک اخلاقی فریضہ نہیں تھا بلکہ آپ واقعاً چاہتے تھے کہ وہ حقوق جن کی طرف لوگ متوجہ بھی نہیں ہوتے ان کا جبران کریں۔ آپ نے حکم دیا کہ گھر سے وہی تازیانہ لایا جائے اور اپنے کرتے کو اوپر اٹھایا تا کہ سوادہ قصاص لے لے۔ اصحاب پیغمبر ﷺ مغموم دل اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ منتظر ہیں کہ کیا ہوگا؟ ناگہاں انھوں نے دیکھا کہ سوادہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اور آپ کو چوم رہا ہے۔ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ نے سوادہ کے لئے دعا کی اور فرمایا: خدایا! سوادہ کو معاف کر جس طرح اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کو معاف کیا ہے۔[۳۰]

جنگ حنین میں جب پیغمبر اکرم ﷺ نے غنائم میں سے کچھ حصہ مصلحتاً نئے مسلموں کو دے دیا تو انصار نے اعتراض کیا اور اپنا اعتراض سعد بن عبادہ کے ذریعہ پیغمبر ﷺ تک پہنچایا۔ اسی ہنگام ذوالخویصرہ نامی شخص نے غصہ کی حالت میں پیغمبر ﷺ سے کہا: میں نے آج دقت کے ساتھ آپ کے امور کا جائزہ لیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ نے تقسیم غنائم میں عدالت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ آپ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: اگر میں عادل نہیں تو کون عادل ہے؟ خلیفہ دوم نے چاہا کہ اس کی اس بات پر اسکی تادیب کرے لیکن آنحضرت ﷺ نے کہا اس کو چھوڑ دو۔ اس وقت سعد بن عبادہ نے انصار کے گلہ آمیز پیغام کو نبی مکرم اسلام ﷺ تک پہنچایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: سب کو ایک جگہ جمع کرو تا کہ میں اس بارے میں وضاحت کروں اور آپ نے اس طرح توضیح دی:

تم گمراہ تھے میرے ذریعہ ہدایت یافتہ ہوئے۔ فقیر تھے بے نیاز ہوئے۔ دشمن تھے مہربان ہوگئے۔ سب نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے درست فرمایا: پیغمبر ﷺ نے فرمایا: تم بھی میرے مقابلہ میں مجھے جواب دے سکتے ہو اور میری خدمات کے مقابلہ میں میری گردن پر جو تمھارے حقوق ہیں ان کو برملا کر سکتے ہو اور کہہ سکتے ہو کہ اے رسول خداؐ! جب قریش نے آپ ﷺ کی تکذیب کی تو ہم نے آپکی مدد کی اور آپ کو پناہ دی۔ جب آپ خالی ہاتھ تھے تو ہم نے آپ کو مدد پہنچائی۔ اے انصار! اس مختصر مال کی بنا پر جو میں نے قریش کو دیا ہے تا کہ وہ دین میں محکم ہو جائیں کیوں غمگین ہوگئے؟ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ دوسرے لوگ اونٹ بکری لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ خدا کی قسم! اگر سب لوگ ایک راستے پر جائیں اور انصار دوسرے راستے پر تو میں انصار کے راستہ کو منتخب کروں گا۔

پیغمبر ﷺ کی منطقی گفتگو انصار کے دلوں پر اتنی اثر انداز ہوئی کہ سب نے کہا: اے رسول خداؐ! ہم اپنے حصہ پر راضی ہیں اور ہم کو کوئی گلہ نہیں ہے۔[۳۱]

پیغمبر اکرم ﷺ نے اسامہ بن زید نامی جوان کو جس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی ایک ایسے لشکر کا

سردار بنایا جس کے بعض سپاہیوں کی عمر اس کی عمر کی کئی گنا تھی۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ عمل بہت سی تنقیدوں اور اعتراضات کا باعث بنا۔ یہ واقعہ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے آخری ایام سے متعلق ہے اور آپ ﷺ ان ایام میں بیمار بھی تھے لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''......اسامہ کی سرداری تم میں سے کچھ کے لئے سخت ہے اور تمہیں اس پر اعتراض ہے لیکن تمھارا یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں ہے۔ پہلے اس کے باپ کے سلسلہ میں تمہیں اعتراض تھا لیکن والد بھی سرداری کے لائق ہے اور بیٹا بھی...'' ۳۲

اس واقعہ میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ان کے اعتراضات اور تنقیدات کو ایسی عادت بتا رہے ہیں جو ماضی میں بھی موجود رہی ہے۔ اگر یہ عادت دستورات الٰہی کے خلاف تھی اور مسلمانوں کو تنقید و اعتراض کرنے کا حق نہیں تھا تو احکام دین لانے والے کے عنوان سے پیغمبر اکرم ﷺ پر لازم تھا کہ اس طرح کے اعمال کی تکرار سے انہیں روکیں جبکہ آپؐ نے ایسا نہیں کیا بلکہ منطقی لہجہ میں ان کا جواب دیا۔

ایک شخص نے پیغمبر اکرم ﷺ کو کچھ قرضہ دے رکھا تھا اس نے اسکا سختی سے مطالبہ کیا۔ حضور ﷺ خاموش رہے لیکن اصحاب کو بُرا لگا اور وہ اس کی تادیب پر آمادہ ہوئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: رکاوٹ نہ بنو صاحب حق کو اپنی بات کہنے دو۔ ۳۳

عبداللہ ابن ابی منافقین مدینہ کا سردار تھا وہ پیغمبر اکرم ﷺ کو اپنی قدرت وحکومت تک رسائی کے لئے مانع سمجھتا تھا چونکہ آنحضرت ﷺ نے اس کی رائے کو ترجیح نہیں دی لہٰذا جنگ احد میں شریک نہیں ہوا اور عملاً مدینہ میں منافقین کا سردار بن گیا۔ اصحاب پیغمبر اکرم ﷺ اس سے سخت ناراض تھے یہاں تک کہ انھوں نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا۔ اس کا بیٹا بھی اس کو قتل کرنے پر تیار تھا لیکن پیغمبر رحمت ﷺ نہ صرف یہ کہ ہر بار اس سلسلے میں رکاوٹ ہوئے بلکہ بیماری کے وقت اس کی عیادت کی اور مرنے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ ۳۴

کتاب اسد الغابہ میں ابن اثیر نے اصحاب پیغمبر کو پہچنواتے ہوئے صحابیات کے باب میں اسماء بنت یزید کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اس نے آنحضرت ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: میں بعض ایسی مسلمان عورتوں کی فرستادہ ہوں جو میری باتوں اور رائے سے متفق ہیں۔ خداوند عالم نے آپکو مردوں اور خواتین سب کے لئے مبعوث کیا ہے ہم آپ پر ایمان رکھتے ہیں اور آپکی پیروی کرتے ہیں۔ ہم عورتیں محدودیت میں ہیں اور گھروں میں عزلت نشیں ہیں، مردوں کیلئے وسائل شہوت اور بچوں کی پیدائش کا ذریعہ ہیں۔ مرد جماعت اور تشییع جنازہ میں شریک ہوکر ہم سے بہتر ہیں جب وہ جہاد پر جاتے ہیں تو ہم انکے اموال کی حفاظت کرتے اور انکی اولاد کی تربیت کرتے ہیں۔ اے رسول خدا ﷺ! کیا ہم ان کے ثواب میں

شریک ہیں؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے اصحاب کی طرف رخ کیا اور فرمایا: کیا تم نے کسی خاتون کی زبان سے دین کے سلسلہ میں اس سے اچھا سوال سنا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں یا رسول اللہ ﷺ! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اے اسماء! تم جن عورتوں کی نمایندگی کر رہی ہو انکے پاس واپس جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ گھر کو مضبوط کرنے اور شوہر کے ساتھ سازگاری کی خاطر تم جو بھی نیک برتاؤ کرتی ہو وہ اس چیز کے برابر ہے جو تم نے کہی ہے اسماء نے جیسے ہی پیغمبر اکرم ﷺ سے اس بشارت کو سنا حمد الٰہی کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ۳۵

ہجرت کے چھٹے سال میں پیغمبر ﷺ نے صلح حدیبیہ کی قرارداد پر سات دفعات کے ساتھ دستخط فرمائے دوسری دفعہ کے مطابق اگر قریش کا کوئی آدمی مکہ سے فرار کر کے مسلمانوں سے مل جائے تو مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ اسے قریش کو واپس کر دیں لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی مکہ چلا جائے تو قریش کی ذمہ داری نہیں تھی کہ اسے مسلمانوں کو واپس کریں بعض مسلمان جن میں خلیفہ دوم بھی تھے اس دفعہ پر معترض تھے کہ یہ دفعہ نا مساوی شرایط کا سبب ہوگی۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے متدل جواب دیتے ہوئے فرمایا: جو مسلمان اسلام سے شرک کی طرف جا رہا ہے اور بت پرستی اور انسانیت مخالف نظام کو اسلامی ماحول اور خدا پرستی کے آئین پر ترجیح دے رہا ہے اس نے دل و جان سے اسلام کو قبول نہیں کیا ہے اور اسکا ایمان محکم نہیں ہے اس طرح کا مسلمان ہمارے لئے مفید نہیں ہے... ۔ ۳۶

ملاحظہ کریں کہ عہد نامہ صلح جو کہ قومی مفادات اور سلامتی کے تناظر میں ہوتا ہے اور قومی مصالح اور حیاتی مفادات کی بنیاد پر اس پر کم تنقید ہوتی ہے اس پر ہونے والے اعتراض کا بھی پیغمبر اکرم ﷺ نے منطقی جواب دیا ہے۔

امام علیؑ اور آزادی بیان

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی ایک نہایت خوبصورت سند جسکو تاریخ اسلام کے زریں اوراق میں شمار کیا جاتا ہے آپ کا جناب مالک اشتر کو لکھا ہوا خط ہے۔ اس کے ایک حصہ میں آپؑ فرماتے ہیں:

> **" وا شعر قلبک الرحمة للرعية والمحبة لهم واللطف بهم ولا تكونن عليهم سبعاً ضارياً تغتنم اكلهم فانهم صنفان : اما اخ لک فی الدین ، او نظیر لک فی الخلق " ۳۷**
>
> "رعایا کے لئے اپنے دل میں رحم و رأفت اور لطف و محبت کو جگہ دو ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ انھیں نگل جانا غنیمت سمجھو اس لئے کہ وہ دو قسم کے

ہیں: یا تمھارے دینی بھائی یا تمھاری جیسی مخلوق‘‘

امام علیہ السلام کے بیان وسلوک سے اچھی طرح واضح ہے کہ آپؑ ایسی حکومت چاہتے تھے جس کے سائے میں آزادی بیان ایک ثقافت سمجھی جائے اوراس کی ترویج بھی ہو چنانچہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

’’ واجعل لذوی الحاجات منک قسما تفرغ لهم فيه شخصک و تجلس لهم مجلساً عاماً فتتواضع فيه لله الذی خلقک و تقعد منهم جندک و اعوانک من احراسک و شرطک حتی يكلمک متكلمهم غير متتعتع ، فانی سمعت رسول اللهؐ يقول فی غير موطن : ولن تقدس امة لا يوخذ للضعيف فيها حقه من القوی غير متتعتع‘‘ ۳۸؎

’’اور اپنے اوقات کا ایک حصہ حاجتمندوں کے لئے معین کردینا جس میں سب کام چھوڑ کر انھیں کے لئے ہو جانا اور ان کے لئے ایک عام دربار رکھنا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ کیلئے تواضع وانکساری سے کام لینا، فوجیوں، نگہبانوں اور پولس والوں کو ہٹا دینا تا کہ کہنے والے بے دھڑک کہہ سکیں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کو کئی موقعوں پر فرماتے ہوئے سنا ہے: اس قوم میں پاکیزگی نہیں آسکتی جس میں کمزوروں کو طاقتوروں سے کھل کر حق نہیں دلایا جاسکتا‘‘

آپ اس سے بڑھ کر مالک اشتر کو سفارش فرماتے ہیں کہ وزیروں اور معاونین میں سے اس شخص کو اپنے خصوصی اجلاس کیلئے منتخب کرو جو کڑوی حق باتوں کو زیادہ تمھارے گوشزد کرے۔

’’ ثم ليكن آثرهم عندک اقولهم بمر الحق لک واقلهم مساعدة فيما يكون منک مما كره الله لاوليائه واقعاً ذلک من هواک حيث وقع ۔۳۹؎

’’پھر تمھارے نزدیک ان میں سے زیادہ ترجیح ان لوگوں کو ہونا چاہئے جو حق کی کڑوی باتیں تم سے کھل کر کہنے والے ہوں اور ان چیزوں میں جنھیں اللہ اپنے مخصوص بندوں کے لئے ناپسند کرتا ہے تمھاری بہت کم مدد کرنے والے ہوں چاہے وہ تمھاری خواہشوں سے کتنی ہی میل کھاتی ہوں‘‘

جو کچھ سودہ ہمدانیہ نے معاویہ کے سامنے حکومت مولائے کائنات علیہ السلام کے بارے میں کہا وہ اس بات

کی گویا ترین سند ہے کہ امام آزادی پر مبنی حکومت تشکیل دینا چاہتے تھے۔ابن طیفور اپنی گرانبہا تحریر بلاغات النساء جو خواتین کے بہترین اقوال پر مشتمل کتاب ہے میں لکھتے ہیں:

سودہ ہمدانیہ شاعر اور مولائے کائنات ؑ کے چاہنے والوں میں تھیں وہ جنگ صفین میں موجود تھیں اور سپاہیوں کی اپنے اشعار کے ذریعہ حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔امام علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد ایک دن معاویہ کے دربار میں اس کے کارندوں کی شکایت کرنے گئیں۔معاویہ نے جب ان کو دیکھا تو کہنے لگا: تم تھیں جو جنگ صفین میں اشعار پڑھ رہی تھیں اور علی و اولاد علی (علیہم السلام) کی حمایت کر رہی تھیں؟

انھوں نے جواب دیا: ہاں اور اس وقت بھی حق سے روگردانی نہیں کروں گی اور معافی نہیں مانگوں گی

معاویہ نے کہا: تم یہ کام کیوں کر رہی تھیں؟

انھوں نے جواب دیا: علیؑ کی دوستی اور حق کی پیروی میں معاویہ نے کہا: بتاؤ کیا چاہتی ہو؟

کہنے لگیں: تیری طرف سے بسر بن ارطاۃ ہمارے یہاں آیا اس نے ہمارے مردوں کو قتل کیا، اموال کو غارت کیا اور طاقت کے زور پر ہم سے چاہتا ہے کہ علی ؑ کو ناسزا کہیں! اگر اس کے حکم کو انجام نہ دیں تو سر بلند اور ارجمند ہو جائیں گے اور تو اے معاویہ اسکو معزول کر کہ اس صورت میں ہم تیرے شکر گزار ہوں گے اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو میں تجھے رسوا کروں گی۔

معاویہ نے کہا: مجھے تو اپنے قوم و قبیلہ کی بنا پر دھمکی دے رہی ہے! ابھی حکم دیتا ہوں کہ تجھے سزا دیں...

سودہ نے سر جھکا کر کہا:

صلی الاله علی روح تضمنه — قبر فاصبح فیه العدل مدفونا

قد حالف الحق لا یبغی به بدلا — فصار بالحق و الایمان مقرونا

درود و سلام اس پر جسم اطہر پر جو قبر میں ہے اور عدالت بھی اسکے ساتھ مدفون ہوگئی ہے وہ ہمیشہ حق کے ساتھ تھا اور حق کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا تھا وہ حق و ایمان کا ملا ہوا وجود تھا۔

معاویہ نے کہا: وہ کون ہے؟

کہا: علی ؑ ابن ابی طالب

معاویہ نے کہا: انھوں نے کیا کیا جو تیرے نزدیک انکو یہ مقام حاصل ہے؟

سودہ نے کہا: میں ایک دن ان کے ایک کارندے کی شکایت کے لئے ان کے پاس گئی۔ میں نے

دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں انھوں نے نماز کو ختم کیا اور مہربانی وعطوفت کے ساتھ پوچھا: کچھ چاہتی ہو؟ میں نے اپنی شکایت ان سے بیان کی آپؑ سن کر رونے لگے اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا! تو میرے اوران کے اوپر گواہ ہے کہ میں نے انہیں مخلوقات پر ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔ پھر اپنے نمائندہ کو لکھا:

جب بھی میرا پیغام ملے تم جو کچھ انجام دے رہے ہو اس کو انجام نہ دو یہاں تک کہ کوئی دوسرا اس کو تم سے لے لے۔

معاویہ ان کی باتوں کو سن کر کہنے لگا: لکھ دو کہ اس کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آئے۔

سودہ نے کہا: فقط میرے لئے؟ یا ان سب کے لئے جن کے ساتھ میں رہتی ہوں؟

معاویہ نے کہا: تجھ کو دوسروں سے کیا مطلب ہے؟

کہنی لگیں: میں اپنے لئے کچھ نہیں چاہتی اگر عادلانہ طریقہ سے سب کو شامل ہو تو قبول کرتی ہوں ورنہ مجھ تک بھی وہ بلا آجائے جو میری قوم تک پہنچے گی۔

معاویہ نے کہا: ''**هيهات ذوقكم ابن ابی طالب الجراة** ''پسر ابوطالب نے تمہیں جرأت کا ذائقہ چکھادیا ہے۔[۴۰]

معاویہ کی مولائے کائنات علیہ السلام سے دشمنی غیر قابل انکار ہے لیکن پھر بھی وہ اس بات کا معترف ہے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے آزادی بیان اور تنقید کے حق کو اپنے پیروؤں میں عام کر دیا تھا اوران کو اس طرح کی آزادی کا بہترین مزہ چکھادیا تھا۔

ایک دن امام علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے کہ خوارج میں سے ایک شخص نے جس کو ابن کوا کہتے تھے، نے امام علیہ السلام کے خلاف نعرہ لگایا اوراس آیت کی تلاوت کی﴿: **ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین** ﴾ [۴۱] اور یقیناً تمھاری طرف اورتم سے پہلے والوں کی طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ اگر تم شرک اختیار کروگے تو تمھارے تمام اعمال برباد کر دیے جائیں گے اورتمھارا شمار گھاٹے والوں میں ہوجائے گا''۔

اس آیت کو پڑھنے اور درحقیقت سیاسی نعرہ لگانے سے اسکا مقصد یہ تھا کہ صفین میں حاکمیت کو قبول کرنے سے علی علیہ السلام نے اپنے سارے امتیازات وافتخارات پر پانی پھیر دیا ہے۔ امام نے قرآن کے احترام میں خاموشی اختیار کی لیکن اس نے پھر دوبارہ اس آیت کو پڑھا امام علیہ السلام نے تیسری مرتبہ اسکے جواب میں اس آیت

کی تلاوت کی:

﴿ فاصبر ان وعد الله حق ولا یستخفنک الذین لا یوقنون ﴾ [۴۱] پس تم صبر سے کام لو کہ خدا کا وعدہ برحق ہے اور خبردار جو لوگ اس امر کا یقین نہیں رکھتے ہیں کہیں وہ تم کو ہلکا نہ بنا دیں۔

اس طرح کے اعتراضات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امامؑ پر ان کے دوران حکومت ہوئے لیکن امام علیہ السلام ان کو اس وقت تک ان کو نہیں روکتے تھے جب تک ان کا برتاؤ سلامتی میں خلل نہ ڈالے ۔[۴۲]

ایک دن آپؑ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے کہ کسی نے آپؑ کے خلاف ایک گوشے سے'' لا حکم الا اللہ: حکومت بس خدا کر سکتا ہے'' کا نعرہ لگایا یعنی اے علی آپ کو حکومت کا حق نہیں ہے۔

کچھ اور لوگ اس کے ساتھ ہو گئے اور یہی نعرہ لگانے لگے۔

امام علیہ السلام نے جواباً فقط یہ کہا: کلمة حق یراد بها الباطل : بات صحیح ہے لیکن اس کا مقصود باطل ہے۔

آج تاریخ نے واضح کر دیا ہے کہ مخالفین کا مقصد کیا تھا۔ لیکن وہ ان کا کردار تھا اور یہ حضرت علی علیہ السلام کی سیرت۔[۴۳]

مشہور ہے کہ ایک دن خطبہ دیتے ہوئے امام علیہ السلام نے فرمایا: جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو قبل اسکے کہ مجھے اپنے درمیان نہ پاؤ! ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا میرے سر و صورت پر کتنے بال ہیں؟ امام علیہ السلام نے جواب دیا: اگر اس کا استدلال و برہان ممکن ہوتا تو میں تم کو ان کی تعداد سے آگاہ کر دیتا۔[۴۴]

جن لوگوں نے خلافت کے آغاز میں آپ کی بیعت نہیں کی انکے مانع نہیں ہوئے، طلحہ و زبیر جیسے بیعت شکن عملاً اسلحہ اٹھا لینے والے اور جنگ کرنے والے افراد کے ساتھ بھی پوری کوشش کی کہ جنگ نہ کریں اور مقابلہ میں نہ آئیں۔ اسی طرح جنگ صفین میں جب خوارج کا مسئلہ پیش آیا تو آپ نے انکے خاص عقاید کی وجہ سے ان کا پیچھا نہیں کیا حتی بیت المال سے ان کے حقوق اور تنخواہیں بھی ادا کیں۔ وہ لوگ بھری محفلوں میں بھی امام کے اوپر تنقید کرتے اور کبھی کبھی بدکلامی پر بھی اتر آتے تھے لیکن امام صبر و تحمل کا مظاہرہ فرماتے تھے مگر جب وہ علی الاعلان جنگ پر آمادہ ہو گئے تو امام علیہ السلام نے بھی ان کے ساتھ جنگ لڑی ۔[۴۵]

امام رضا علیہ السلام اور آزادی بیان

امام رضا علیہ السلام کا زمانہ دائرہ علم کی توسیع کا زمانہ کہا جاتا ہے علم و دانش سے لگاؤ رکھنے کی وجہ سے

مامون ایک طرف علماء وصاحبان علم کا احترام کرتا اور علمی جلسات منعقد کرتا تھا اور دوسری جانب اپنی حکومت کے مرکز طوس میں امام رضا علیہ السلام کے وجود مبارک کو غنیمت سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے امام رضا علیہ السلام اور دوسرے ادیان مسیحیت، یہودیت، زرتشت وغیرہ کے رہنماؤں کے ساتھ علمی مناظروں کو منعقد کیا اگر چہ ان علمی نشستوں کو برپا کرنے کے پیچھے مامون کے اغراض مشکوک ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ آپ ان جلسات میں شریک ہونے کیلئے آزاد تھے۔ امام علیہ السلام کے بعض چاہنے والوں نے آپ کو مناظروں میں شرکت سے منع بھی کیا اور ان کو مامون کی ایک سازش بتایا مگر اسکے باوجود امام علیہ السلام نے مناظرہ میں شرکت کو ترجیح دی۔ مورخین نے مناظرہ کرنے والوں کی خصوصیات، مباحثہ کی کیفیت اور اس میں پیش ہونے والے مباحث ومطالب کو بالتفصیل بیان کیا ہے ۔[۴۶]

امام علیہ السلام مناظرہ میں ایسے وقت میں شریک ہوئے جب آپ ولیعہد تھے اور پشت پردہ سیاسی سازشوں کے بجائے آپ کو سیاسی حمایت حاصل تھی۔ یعنی آپ اپنی ولیعہدی کی قدرت کو استعمال کرتے ہوئے اپنے منافع ومصالح کی خاطر اس مناظرہ کو ترک بھی کر سکتے تھے لیکن امام نے ایسا نہیں کیا بلکہ مناظرہ میں شرکت کی اور مختلف ادیان ومذاہب کے بزرگوں سے وسیع اور کامل معلومات کے ساتھ گفتگو کی۔

مناظرہ کے بعد جب سب لوگ مطمئن ہو گئے اور امام کے استدلال کو سن کر محفل پر سکوت طاری ہو گیا تو آپ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی بھی مخالف اسلام ہے اور کچھ پوچھنا چاہتا ہے تو شرمائے بغیر سوال کرلے [۴۷] اس کے بعد بھی مناظرہ جاری رہا۔

ہم نے تمام رہنماؤں کے بجائے صرف پیغمبر اسلام ﷺ، حضرت علیؑ اور حضرت امام رضا علیہ السلام کی حیات طیبہ کے بعض عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس لئے کہ یہ حضرات اپنی زندگی کے ایک حصہ میں یا حکومتی امور کو سنبھالے ہوئے تھے یا اس میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ دیگر رہنماؤں کی زندگی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بھی مخالفین کے افکار پر صبر وتحمل کیا ہے مثلا امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابن ابی العوجاء جیسے افراد کے مقابلے میں، جو اپنے زمانی کا عالم تھا، ایسی روش اختیار کی کہ آپکی روش اس کے لئے نمونہ بن گئی اور وہ مولا کے ان صحابیوں سے جو صبر وتحمل نہیں کر سکتے تھے کہتا تھا: اگر تم جعفر ابن محمد (علیہما السلام) کے شاگرد ہو تو (صبر کرو) ہم انہیں باتوں کو ان کے سامنے کہتے ہیں تو وہ برہم نہیں ہوتے بلکہ سکون واطمینان کے ساتھ ہماری بات سن کر اسکا منطقی جواب دیتے ہیں ۔[۴۸]

لہٰذا پتہ چلا کہ آزادی بیان دینی رہنماؤں کی زندگی میں ایک قابل احترام قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور

یہ حضرات اس پر پابندی سے عمل کرتے تھے ایک اسلامی معاشرے کو چاہئے کہ وہ اپنے دینی رہنماؤں کی سیرت کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ عمل بنائے یہی مقام ہے کہ موسس انقلاب اسلامی امام خمینی ؒ فرماتے ہیں:

''دین اسلام عقل و منطق اور برہان و دلیل پر قائم ہے اور آزادی بیان سے خوف نہیں کھاتا''۔[۹]

آخر میں پھر ذکر کردیں کہ اس بحث کا مقصد یہ تھا آزادی بیان کو دینی تعلیمات اور مبانی میں ایک اصل کی حیثیت حاصل ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ حق کسی بھی حقوقی نظام یا بین الاقوامی سند میں بے لگام یا بلا قید و شرط نہیں ہے، بلکہ اگر کسی دوسرے کی آزادی خطرے میں پڑ جائے تو محدود ہو جائے گا، نیز اخلاق اور عمومی نظم و انضباط بھی آزادی بیان کی قبول شدہ محدودیتیں ہیں البتہ آزادی بیان کے حدود کی بحث خود ایک مستقل بحث ہے جسکے لئے الگ سے وقت درکار ہے۔

حواشی

۱۔ رحمان/۱۔۴

۲۔ اسرا/۷۰

۳۔ مفسرین کہتے ہیں کہ سورہ رحمان کی چوتھی آیت میں بیان سے مراد فقط زبان، الفاظ یا بولنے والی طاقت نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز مراد ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے ضمیر کی آواز کو دوسروں تک پہنچا سکے بیان الٰہی نعمتوں کی خوبصورتیوں میں ایک ہے سورے کے آغاز و اختتام میں استعمال ہونے والے کلمات کی ترتیب کا انداز بہت پیارا و نرالا ہے رحمان، قرآن، انسان و بیان جیسے کلمات سورہ کے آغاز میں آئے ہیں سورہ رحمانیت خدا سے شروع ہوتا ہے اور اسکی ثنا و حمد پر اختتام پذیر۔ جب بھی خدا کو رحمانیت سے یاد کیا جائے اس کا مطلب ہے کہ اسکی نعمتیں تمام نوع بشر کے لئے ہیں چاہے وہ کسی بھی قوم و ملت سے ہو، مومن ہو یا غیر مومن، کالا ہو یا گورا۔ دیکھئے: المیزان، الطبعة الثانیة، موسسة الاعلمی، بیروت، ۱۹۸۳ھ، ج/۱۹، ص/۹۵.

۴۔ Obligtion of Result.

۵۔ Freedom of speech.

۶۔ علی آقا بخشی، فرھنگ علوم سیاسی، مرکز اطلاعات و مدارک علمی ایران، ۱۳۷۴ش، ۹۸۵.

۷۔ Freedom of Expression.

۸۔ حسین مھر پور، حقوق بشر و راھکارھای اجرائی آن، انتشارات اطلاعات، ص۱۶۰، مذکورہ تعریف سوئیڈن کے آئین میں آزادی بیان کی تعریف ہے جو پہلے بند کی دوسری فصل میں ذکر ہوئی ہے اسی طرح ڈینمارک کے آئین کا ۷۷ بخش آزادی بیان کی تعریف کے سلسلے میں کہتا ہے: ہر شخص حق رکھتا ہے کہ اپنی سوچ و چار اور فکر و نظر کو منتشر کر سکے، لکھ سکے اور کہہ سکے بشرطیکہ عدالت میں جواب دے سکتا ہو۔

۹۔ ناصر کاتوزیان و ھمکاران، آزادی اندیشہ و بیان، انتشارات دانشکدہ حقوق و علوم سیاسی دانشگاہ تھران، ۱۳۸۲، ص/۱۰۷۔۱۰۸.

۱۰۔ بقرہ/۱۱۱

۱۱۔ زمر/۱۸

۱۲۔الطبرسی،الاحتجاج،موسسہ الاعلمی للمطبوعات، بیروت،۱۹۸۳،ص/۱۳

۱۳۔آل عمران/۱۰۴

۱۴۔نہج البلاغہ، وصیت، ۴۷.

۱۵۔ناصر کاتوزیان وھمکاران، گذشتہ حوالہ،ص/۳۰۶

۱۶۔مصطفیٰ ابراھیم الزلمی،حقوق الانسان فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الدولی، بیت الحکمۃ ،العراق،۱۹۹۸،ص/۲۴

۱۷۔آل عمران /۱۵۹

۱۸۔محمد ھادی معرفت،حقوق متقابل مردم وحکومت، پژوھشگاہ فرھنگ واندیشہ، ج۵،ص۱۹۷۔۱۹۵.

۱۹۔الحمیری البغدادی: قرب الاسناد،موسسہ آل البیت لاحیاء التراث،قم،۱۴۱۳،ص۱۰۰.

۲۰۔نہج البلاغہ،خطبہ:۳۴.

۲۱۔محمد رضا،محمد وعلی حکیمی،الحیاۃ، دفتر نشر فرھنگ اسلامی،تھران،۱۳۷۰، ج۱،ص۱۹۶

۲۲۔سید حسن اسلامی، تاملاتی در مفھوم انتقاد، مجموعہ مقالات ھمایش بین المللی حقوق بشر وگفتگوی تمدنھا،ص۳۹۔۳۸.

۲۳۔نمونہ کے طور پر دیکھئے: محمد صالح مازندرانی، شرح اصول کافی، ج۷،ص۱۹/شرح النووی،صحیح مسلم، دارالکتاب العربی، بیروت،االطبعۃ الثانیہ،۱۴۰۷، ج۲،ص۳۸.

۲۴۔نصر اللہ عبدا سمع مقالتی فوعاھا وحفظھا وبلغھامن لم یسمعھا...ثلاثۃ لایغل علیھن قلب امرء مسلم اخلاص العمل للہ ، النصیحۃ لائمۃالمسلمین واللزوم لجماعتھم،الکلینی،الکافی،التحقیق علی اکبر غفاری ،دارالکتب الاسلامیہ، ج/ص/۴۰۳

۲۵۔''الدعاء الی مافیہ الصلاح والنھی عمافیہ الفساد''،المنجد فی اللغۃ ،ذیل کلمہ نصح.

۲۶۔المتقی الھندی، کنزالعمال،موسسہ الرسالۃ ، بیروت، ج۳،ص۶۴.

۲۷۔محمد صالح مازندرانی، گذشتہ حوالہ.

۲۸۔بند۳(الف) مادہ۹''اعلامیہ مربوط بہ حقوق ومسئولیت افراد، گروھھا ونھادھای اجتماعی برای تقویت وحمایت ازحقوق بشر وآزادی ہای سیاسی بہ رسمیت شناختہ شدہ جھانی'' A\Res\53\114,8 March 1999

۲۹۔آل عمران:۱۵۹.

۳۰۔جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، نشر دانش اسلامی،۱۳۶۳، ج۲،ص۵۰۲۔۵۰۱.

۳۱۔گزشتہ حوالہ،ص۳۷۰۔۳۶۹.

۳۲۔گزشتہ حوالہ،ص۴۸۸۔۴۸۷.

۳۳۔حسین مرزاخانی، گزیدہ ای از تاریخ تحلیلی اسلام، انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی،۱۳۶۹،ص۱۱۴.

۳۴۔گزشتہ حوالہ،ص۱۳۸.

۳۵۔احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، دارالنھضۃ العربی، القاھرہ،۱۹۹۲،ص۱۴۷.

۳۶۔حسین مرزاخانی، گذشتہ حوالہ،ص۱۱۶.

۳۷۔نہج البلاغہ، نامہ:۵۳.

۳۸۔نہج البلاغہ، نامہ:۵۳.

۳۹۔نہج البلاغہ، نامہ:۵۳.

۴۰۔دیکھئے:سید محسن الامین،اعیان الشیعہ ،دارالتعارف للمطبوعات، بیروت،۱۹۸۶،ج ۷،ص۳۲۴:ابن طیفور، بلاغات النساء،منشورات داوری،قم،ص۳۰.

۴۱۔زمر:۶۵.

۴۱۔روم:۶۰.

۴۲۔الطبرسی، گذشتہ حوالہ،ص۲۲۷.

۴۳۔سید رضا صدر، راہ علیؑ ،انتشارات ۲۲بھمن ،ص ۳۷.

۴۴۔الطبرسی، گزشتہ حوالہ،۲۶۱.

۴۵۔دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ: درآمدی برحقوق اسلامی، سمت،ص۲۷۲.

۴۶۔الطبرسی، گزشتہ حوالہ،ص۴۳۲۔۴۱۵.

۴۷۔گزشتہ حوالہ،ص۴۲۴.''یاقوم ان فیکم احد یخالف الاسلام وارادان یسال فلیسال غیر محتشم''.

۴۸۔دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، گذشتہ حوالہ،ص۴۲۷بحارالانوار، ج ۳، ۵۸سے منقول.

۴۹۔صحیفہ نور، ج۹،ص۱۸۷.

عدالت اور حکومت امام علیؑ کی نظر میں

مصطفے خلیلی

ترجمہ: فیروز علی بنارسی

خلاصہ

امیر بیان حضرت امام علی علیہ السلام کے کلمات واقوال میں ذراسی غور وفکر سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''عدالت وحکومت'' کا مسئلہ آنحضرتؑ کے نزدیک ایک خاص منزلت اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دونوں موضوع اس درجہ اہم ہیں کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کی تمامتر کوششوں اور مجاہدت کو ان کے تحقق کی راہ میں سمجھیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ آنحضرتؑ کے لئے عدالت کے بغیر حکومت جانور کی ناک سے نکلنے والی رطوبت یا بوسیدہ نعلین سے بھی کم قیمت ووقعت رکھتی ہے۔

ہر دور بالخصوص دور حاضر میں اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر کوشش کی گئی ہے کہ اس تحریر میں مذکورہ موضوع کی تحلیل وتحقیق کی جائے۔

معنی عدالت

لفظ عدل وعدالت لغت میں انصاف اور داوری کے معنی میں ہے اور شاید اس کا بہترین معنیٰ وہ مفہوم ہے جسے امام علی علیہ السلام نے اس بارے میں بیان فرمایا ہے: ''العدل یضع الامور مواضعھا'' (نہج البلاغہ، قصار /

۴۳۷) یعنی عدل ہر شے کو اس کے مقام پر رکھتا ہے۔ ایک مولف، عدالت کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''دلالت کے اعتبار سے لفظ عدالت، مساوات کے معنیٰ میں ہے۔ اور عدالت یعنی مساوات، انصاف، میانہ روی اور حد اعتدال کی رعایت اور ہر امر میں حد وسط کا خیال رکھنا ہے۔ لہٰذا عادل وہ شخص ہے جو لوگوں کے ساتھ انصاف سے کام لے اور اپنے ساتھ بھی انصاف سے کام لے عدل یعنی ہر شے کو اس کی جگہ پر قرار دینا اور ہر شخص کے حق کو کما حقہ ادا کرنا'' (فرہنگ معارف اسلامی، ص/۱۲۴۱)

درحقیقت عدل، صاحب حق کو اس کا حق دینا یا ہر شخص یا شے کے طبیعی حق کا لحاظ رکھنا ہے اور اس کے مقابلہ میں ظلم، افراد اور اشیاء کے حق کو نظر انداز کرنا ہے۔

عدل اور ظلم کے درمیان فرق کی وضاحت

عدل اور ظلم کے درمیان ظاہری فرق یہ ہے کہ کہا جائے کہ عدالت یعنی راستی، درستی اور صاحبان حق کو ان کا حق دینا ہے اور ظلم یہ ہے کہ اشیاء یا افراد میں ان امور کو نظر انداز کرنا اور کسی شے کو اس کی جگہ سے خارج کرنا ہے۔ لیکن امام علی علیہ السلام نے لفظ عدل اور ظلم کی وضاحت میں کچھ ظریف و دقیق نکات بیان فرمائے ہیں۔

حضرتؑ نے ان دونوں لفظ کو حق و باطل کے مثل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:'' **العدل صورة واحدة و الجور صور کثیرة**'' (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، ج ۲۰، ص ۲۷۶)

عدل و انصاف کا ایک چہرہ ہے اور ظلم و ستم کے بہت سے چہرے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ عدل، حق کے مانند ایک ثابت اور معین امر ہے۔ عدل کا چہرہ واضح ہے اس لئے کہ وہ ہر جگہ اپنے اسی واقعی چہرہ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے لیکن ظلم، باطل کے مانند ہے کہ اس کے متعدد اور مختلف چہرے ہیں اور وہ لوگوں کو شک و شبہہ میں ڈال دیتا ہے۔

عدل قائم کرنا مشکل اور ظلم ایک آسان کام کیوں ہے؟

اس بات کی دلیل کہ عدالت کا نافذ کرنا اور عدل قائم کرنا دشوار ہے اور اپنے اوپر یا دوسروں پر ظلم کرنا سہل و آسان ہے، امام اول علیہ السلام کے اس قول سے واضح ہوجاتی ہے: عدل کا ایک راستہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن ظلم کے مختلف اور متعدد راستے ہیں۔ یہ دونوں (عدل اور ظلم) ہدف پر تیر لگنے یا تیز اندازی میں خطا کر جانے

کے مانند ہیں۔ وہ لوگ جن کے تیر خطا کر جاتے ہیں ان کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن کے تیر ہدف پر لگتے ہیں اس لئے کہ ہدف پر تیر لگانے کے لئے بہت زیادہ سعی وکوشش اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن تیر کے خطا کر جانے کے لئے ان امور کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ خوبصورت اور ظریف تشبیہ حضرت علیؑ کی ہے:

''و هما يشبهان الاصابة فى الرماية و الخطا فيها و ان الاصابة تحتاج الىٰ ارتياض و تعهد و الخطا لا تحتاج الىٰ شيء من ذلك''

(گزشتہ حوالہ)

''یہ دونوں تیراندازی میں ہدف پر لگنے اور خطا کر جانے کے مثل ہیں اس لئے کہ ہدف پر تیر لگنے کے لئے کوشش اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن تیر کے خطا کر جانے کے لئے ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے''

البتہ یہاں پر سعی وکوشش اور مہارت سے مراد، دینداری میں سعی وکوشش اور ایمان میں مہارت ہے۔ کوئی بھی شخص تیر کو ہدف پر لگانے اور عدل وانصاف کے قائم کرنے پر قادر نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ دینداری، خوف خدا او رحق پر ایمان میں ایک پاک و پاکیزہ انسان ہو۔ امام علی علیہ السلام کے اس قول کو اگر انسانی تمدن کی تاریخ پر منطبق کیا جائے تو کسی تفسیر وتوضیح کی ضرورت نہ ہوگی اس لئے کہ پوری تاریخ میں اگر بشریت کی مختصر خدمت ہوئی ہو تو یہ ان حکمرانوں کی دین ہے جو غیرت دینی رکھتے تھے۔

ایمان اور عدل کا رابطہ

اگر عدل کا معنی ہر شئے کو اس کی اصلی جگہ پر رکھنا ہو تو عادل وہ شخص ہے جو ہر شئے کو اس کی جگہ پر رکھے یعنی تمام انسانوں کے حقوق کا لحاظ رکھے اور اس سلسلہ میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہ کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ہر انسان ایسی قدرت وقوت سے بہرہ مند ہوسکتا ہے یا صرف کچھ خاص افراد اس قوت وتوانائی سے بہرہ مند ہیں؟

امیر المومنین علیہ السلام کا جواب یہ ہے کہ عدل کا سرچشمہ ایمان ہے، ایمان عدل کی بنیاد اور پایہ ہے اور عدل وانصاف، ایمان کا پھل اور نتیجہ ہے۔ جب تک انسان اپنی دینداری کو قوی نہ بنائے اور خوف خدا میں کسی درجہ تک نہ پہونچ جائے اس وقت تک وہ عدل وانصاف کے نفاذ میں عاجز رہے گا، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی مسلمان ایمان رکھتا ہو اور اپنی خانوادگی اور سماجی زندگی میں عدل وانصاف کو پامال کرے۔ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام کی

حیثیت سے فرماتے ہیں: العدل راس الایمان و جماع الاحسان۔ (غرر الحکم و درر الکلم، عبدالواحد تمیمی آمدی، ج ۱/ ص ۸۴، ح ۱۷۳۳) عدل و انصاف ایمان کا سر اور احسان کو جمع کرنے والا ہے۔

قرآن میں عدالت کو تقویٰ کا اہم ترین رکن قرار دیا گیا ہے لہٰذا ایمان اور عدالت کے درمیان ایک اٹوٹ رابطہ ہے اور ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں ڈالی جا سکتی۔

عدل وانصاف کا قیام، برکت کا باعث

نعمتوں کی فراوانی، قحطی، خدا کی برکتوں یا نعمتوں میں کمی کا تعلق، انسانوں کے اعمال و کردار سے ہے۔ قرآن کریم کی بعض آیتیں واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں:

﴿ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُون ﴾
(سورۂ اعراف، آیت/۹۶)

''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا''

بہت سے مفسرین نے یہاں پر ''برکات'' سے مراد بارش اور کھیتوں کی پیداوار اور ہریالی کو قرار دیا ہے۔ بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ کائنات میں تبدیلی اور انسانوں کے اعمال و کردار کے درمیان دو طرفہ رابطہ پایا جاتا ہے یعنی جس طرح انسان سردی میں گرم لباس اور گرمی میں سرد لباس پہنتے ہیں اسی طرح کائنات بھی انسان کے اعمال و کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ اگر انسان ظلم، بے ایمانی، فساد اور ناپاکی کی طرف جاتے ہیں تو آسمانی بلائیں، جنگ کے فتنے، لڑائی جھگڑے اور قحطی انھیں گھیر لیتی ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاس ﴾ (سورۂ روم، آیت/۴۱)

یعنی جو فساد اور تباہی خشکی اور دریا میں ظاہر ہوتے ہیں وہ لوگوں کے ہاتھوں انجام پانے والے اعمال کا نتیجہ ہیں:

﴿ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ ﴾ (سورۂ شوریٰ، آیت/۲۹)

جو برا حادثہ تمھیں سامنے پیش آتا ہے وہ اس چیز کی وجہ سے ہے جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے انجام

دیا ہے۔

پس ایمان اور عمل صالح جو عدالت اس کے نمایاں مصادیق میں سے ہے، کے ذریعہ بندوں پر خدا کی برکتیں نازل ہوتی ہیں اور بے ایمانی، ظلم، فساد، تباہی و بربادی کی بنا پر بندوں سے نعمتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ امام علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: عدل و انصاف سے برکتیں کئی گنا ہو جاتی ہیں۔ (**بالعدل تتضاعف البرکات**. غرر الحکم، ج ۱، ص ۲۹۱، ح ۳۳) ظلم و ستم نعمتوں کو دور کر دیتا ہے۔ (**الظلم یطرد النعم**. گزشتہ حوالہ، ص ۳۸، ح ۶۰۷) ظلم پیروں کو لرزا دیتا ہے، نعمتوں کو سلب اور امتوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (**الظلم یزل القدم و یسلب النعم و یھلک الامم**. گزشتہ حوالہ، ص ۸۶، ح ۱۶۷۲)

حکومت اور ملت کا قوام عدالت سے ہے

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں عدالت اس درجہ اہمیت کی حامل ہے کہ اسے نظر انداز کرنا، سماجی ثبات و استقامت کو متزلزل کر دیتا ہے اور پوری ملت کی شکست کا باعث بنتا ہے اور اسے جاری کرنا معاشرہ کی پائیداری اور استحکام کا سبب بنتا ہے: **العدل قوام البریة و الظلم بوار الرعیة** (گزشتہ حوالہ، ص ۱۴۱، ح ۸۵۷۔۸۵۶) عدالت لوگوں کی پائیداری و استقامت کا باعث ہے اور ظلم و ستم ملت کی ہلاکت کا سبب ہے۔

اتحاد اور سماجی یکجہتی کی حفاظت اور عمومی امن و امان، عادلانہ رفتار و کردار کی مرہون منت ہے اور اس کے برخلاف تفرقہ، جدائی، گروہی اور ملکی اختلافات اور اجتماعی کشیدگیوں کا سرچشمہ ظلم و بے عدالتی ہے۔ عدل و انصاف انسانی سماج کی بقا و دوام ہی کا باعث ہوتا ہے اور انھیں ایک دوسروں کے قریب لاتا ہے اور ایک سالم اور ترقی یافتہ سماج ہی وجود میں نہیں لاتا بلکہ حکومتوں کو باقی رکھنے کا ایک سب سے بڑا سبب ہے۔

جو حکومتیں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتی ہیں ان کی حاکمیت کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے اور ان کا اقتدار وقتی ہوتا ہے اس لئے کہ انھوں نے اپنی ستمگری اور بے عدالتی سے اپنی نابودی پر مہر لگائی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: **من جارت ولایته زالت دولته**. (گزشتہ حوالہ، ج ۲، ص ۱۸۷، ح ۱۵۷) جو اپنی حکومت کے دوران ظلم و ستم کرے گا اس کی حکومت نابود ہو جائے گی۔ یا: **من عمل بالعدل حصن الله ملکه**. (گزشتہ حوالہ، ص ۲۰۹، ح ۱۰۶۸) جو عدل و انصاف سے کام لے گا خداوند عالم اس کے ملک کی حفاظت کرے گا۔ امام علیہ السلام حکومت کے ثبات اور پائیدری کی حفاظت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: **ثبات**

الدول بالعدل . (گزشتہ حوالہ، ج ۱/ص ۲۳۹، ح ۳۰) حکومتوں کی پائیداری اور بقا، عدل وانصاف کے قیام پر ہے۔ یا ارشاد فرمایا: زین الملک العدل . (گزشتہ حوالہ،ص ۳۸۵، ح ۲۳) بادشاہی کی زینت اور حکمرانی کا زیور عدالت کا اجراء ونفاذ ہے۔

فارسی نظم ونثر میں بھی کہ غالباً ان کا سرچشمہ روایات ہیں اس موضوع کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سعدی نے اسطرح نظم کیا ہے:

خبرداری از خسروان عجم　　　　که کردند بر زیر دستان ستم ؟

کیا تم عجم کے بادشاہوں سے باخبر ہو کہ انھوں نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کیا۔

نه آن شوکت و پادشاهی بماند　　　　نه آن ظلم بر روستایی بماند

نہ وہ شان وشوکت اور حکومت باقی رہی اور نہ دیہاتیوں پر وہ ظلم وستم باقی رہا۔

خبرداری از خسروان عجم　　　　که کردند بر زیر دستان ستم ؟

کیا تم عجم کے بادشاہوں سے باخبر ہو کہ انھوں نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کیا۔

خطا بین که بر دست ظالم برفت　　　　جهان ماند و او با مظالم برفت

خطا دیکھو کہ گناہ ظالم کے ہمراہ گیا　دنیا رہ گئی اور وہ اپنے ظلم وستم کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

خنک روز محشر تن دادگر　　　　که در سایه عرش دارد مقر

روز قیامت عادل سکون سے　ہوگا کہ وہ عرش الٰہی کے سایہ میں جگہ پائے گا۔

چو خواهد که ویران شود عالمی　　　　کند ملک در پنجه ظالمی

جب وہ چاہتا ہے کہ عالم کو ویران کرے تو وہ حکومت کو کسی ظالم کے پنجہ میں دے دیتا ہے۔

(بوستان سعدی، باب اول،ص ۵۹)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مسلمان دانشوروں، عالموں اور ادیبوں نے اپنے آثار اور کتابوں میں مختلف مناسبتوں سے عدل وانصاف اور ظلم وستم کے برے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ سعدی جو اپنی کتاب بوستان میں ایک پسندیدہ دنیا کا نقشہ کھینچتے ہیں ان کی نظر میں اس پسندیدہ دنیا کی بنیاد عدل وانصاف پر ہے اسی لئے وہ اپنی اس بیش قیمت کتاب کے پہلے باب کا نام ''عدل وتدبیر اور رائے'' رکھتے ہیں۔ اس نامور شاعر اور ادیب نے حضرت علی علیہ السلام کے اس قول: '' لیست تصلح الرعیة الا بصلاح الولاة و لا تصلح الولاة الا باستقامة

الــرعية ’’ (رعایا کی اصلاح ممکن نہیں ہے جب تک والی صالح نہ ہوں اور والی صالح نہیں رہ سکتے جب تک رعایا استقامت و پائیداری سے کام نہ لیں۔نہج البلاغہ، خطبہ/۲۱۶) سے مدد لیتے ہوئے اس طرح نظم کرتے ہیں:

که خاطر نگهدار درویش با نـه در بند آسایش خویش باش

اس بات کو ذہن نشین کرلو کہ ہمیشہ قناعت پسند درویش رہو، اپنے آرام و آسائش کی قید میں نہ رہو۔

خـرابـی و بـدنـامـی آید ز جور رسـد پیش بین این سخن به غور

ظلم جور سے خرابی و بدنامی حاصل ہوتی ہے اور اس کا انجام تمھیں ملنے والا ہے لہذا اس باتوں پر غور کرو۔

بـر آن بـاش تـا هر چه نیت کنی نـظـر در صـلاح رعیت کنـی

جس چیز کی نیت کرلی ہے اسی پر باقی رہو۔ رعایا کی بھلائی میں فکر کرو۔

از آن بهـره ور تر در آفاق نیست که در ملک رانی به انصاف نیست

دنیا میں اس سے مفید کوئی چیز نہیں یعنی حکمرانی میں انصاف سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

ظلم کی نشانیاں امام علی علیہ السلام کی نظر میں

امام علی علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو ظالم و ستمگر کی پہچان بتائی ہے:

” لـلـظـالم من الرجال ثلاث علامات: یظلم من فوقه بالمعصیة و من دونه بالغلبة و یظاهر القوم الظلمة “. (مستدرک نہج البلاغہ، ص/۱۶۳)

’’ظالم کی تین نشانیاں ہیں: اپنے سے برتر (پروردگار عالم) کی نافرمانی کرتا ہے، اپنے سے نیچے والوں پر ظلم کرتا ہے اور ظالم جماعت کی حمایت کرتا ہے‘‘

اس کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظلم و ستم صرف دوسروں کے حقوق میں تجاوز اور زیادتی میں منحصر نہیں ہے بلکہ ظلم کی دو اور بھی صفتیں ہیں یعنی ظلم کا ایک ہی مصداق نہیں ہے بلکہ اس کے تین مصداق ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں کسی ایک کو بھی انجام دے تو اسے ظالم کہا جائے گا: خدا کی نافرمانی، دوسروں کے حقوق کو ضائع کرنا اور ظالم کا دفاع کرنا۔ مولائے کائنات امام علی علیہ السلام کے اس قول زرین سے ایک ظریف و دقیق نکتہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی گنہگار، خدا کے احکام و دستورات کی نافرمانی کی صورت میں عادل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ نافرمان اور گنہگار، ظالم ہے عادل نہیں۔ حتیٰ قوانین اور دستورات خداوندی کو نظر انداز کرنا اور اسے پامال کرنا حضرت علی علیہ السلام

کی نظر میں بدترین ظلم ہے: **اقبح الظلم منعک حقوق الله** . (غرر الحکم، ج ۱/ص ۱۹۴، ح ۲۹۲) بدترین ظلم یہ ہے کہ خدا کے حقوق کو ادا نہ کرو۔

لہٰذا اجتماعی امور میں اسی وقت عدل ممکن اور مقدور ہے جب ایک مومن حاکم برسر اقتدار ہو۔

حکومت کی ضرورت اور حاکم کی ذمہ داری حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں

انسان کی خلقت ہی کچھ اس طرح ہے کہ وہ اپنے دیگر ہمنوع افراد سے جدا اور انفرادی طور پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہمنوع افراد کے درمیان زندگی بسر کرے۔

تمام موجودات کے درمیان بالخصوص انسانوں جو کہ تعقل و تدبر کی صلاحیت رکھتے ہیں کے درمیان کچھ ضروریات پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک، مرکزی حکومت کے اجراء اور نفاذ کی ضمانت کے ساتھ ایک مدون قانون بھی ضروری ہے۔

حکومت، اجتماعی زندگی کا لازمہ ہے اور اس کا انکار درحقیقت اجتماعی زندگی کا انکار ہے اور اجتماعی زندگی کے انکار کا مطلب نوع انسانی کی ہلاکت و نابودی ہے، حضرت علی علیہ السلام نے جب خوارج کی یہ بات سنی کہ "**لا حکم الا لله**" تو فرمایا:

> "كَلِمَةُ حَقِّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ ! نَعَمْ اِنَّهُ لا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ، وَلٰكِنَّ هٰؤُلاءِ يَقُوْلُوْنَ : لاَ اِمْـرَةَ اِلَّا لِلّٰهِ ، وَاِنَّهُ لابَـدَّلِلنَّاسِ مِنْ أَمِيْرٍ بَرٍّ أَوْفَاجِرٍ يَعْمَلُ فِي اِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ ، و يَسْتَمْتِعُ فِيْهَا الْكَافِرُ"
>
> "یہ ایک کلمہ حق ہے جس سے باطل معنی مراد لئے گئے ہیں۔ بیشک حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔ لیکن ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حکومت اور امارت بھی صرف اللہ کے لئے ہے حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ نظام انسانیت کے لئے ایک حاکم کا ہونا بہرحال ضروری ہے چاہے نیک کردار ہو یا فاسق کہ حکومت کے زیر سایہ ہی مومن کو کام کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور کافر بھی اپنا فائدہ اٹھاتا ہے" (نہج البلاغہ، خطبہ/۴۰)

درحقیقت حکومت کا انکار یا دین کی دنیا اور اجتماعی روابط سے بے تعلقی خوارج کے عقائد میں ہے جسے پہلے بیان کیا گیا۔ یہاں پر جو چیز مورد بحث ہے وہ حاکم کے صفات و خصوصیات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا حاکم کے لئے صرف سیاسی میدان میں ضرورت بھر درایت کا ہونا کافی ہے؟ کیا قوی مدیریت اور باہوش تدبیر کا ہونا ہی حاکم و

والی کے بااہمیت ہونے کوصحیح قرار دیتا ہے؟ کیا شریعت میں مدیریت اور انتظامی معاملات میں یہ ظاہری صفات ہی کافی قرار دیئے گئے ہیں یا دیگر صفات بھی بیان ہوئے ہیں؟

شریعت کی زبان میں اگرچہ مذکورہ تمام صفات پر تاکید کی گئی ہے لیکن ان اوصاف وشرائط کو کافی نہیں جانا گیا ہے جو چیز حاکم کے صفات کومکمل اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرتی ہے وہ صفت عدالت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں جو چیز حکومت کواہمیت بخشتی ہے وہ حاکم کا وجود ہے اور جو چیز حاکم کوفضیلت اور برتری عطا کرتی ہے وہ صفت عدالت ہے۔ پس اجتماعی امور پر حاکمیت، ولایت اور سرپرستی کی کوئی اہمیت نہیں ہے مگر یہ کہ حاکم عادل کی جانب سے عدل وانصاف کا قیام ہو اور صاحبان حق کا حق انھیں واپس دیا جائے: **لا رياسة كالعدل فى السياسة.** (غرر الحکم، ج۲،ص ۳۶۸، ح ۴۵۹) سیاست میں عدل وانصاف کے مانند کوئی ریاست وحکومت نہیں ہے اور حاکم کے لئے سوائے عدالت کے کوئی برتری، منزلت اور فضیلت نہیں ہے۔ **العدل فضيلة السلطان.** (گزشتہ حوالہ، ج ۱،ص ۳۷، ح ۵۳۷)؛ عدالت سلطان اور حاکم کی فضیلت ہے۔

لہٰذا حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں حاکم کی سب سے اہم ذمہ داری عدل وانصاف کا قیام ونفاذ ہے اور یہ کام کسی کے لئے ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ حاکم احکام الٰہی پر ایمان رکھتا ہو۔ (جو شخص خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ عادل نہیں ہوسکتا) پس حاکمیت مومنین کا حق ہے۔

ظالم حاکم حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں بہترین حاکم وہ ہے جو مظلوموں کے حقوق کو ظالموں سے لے کر انھیں واپس دے سکے۔

دوسری جانب ظالم وجابر حاکم جو لوگوں کے حقوق کے سلسلہ میں لاابالی اور بے پرواہ ہو اور دوسروں کے حقوق کو ضائع کرنا اس کے نزدیک کوئی خاص بات نہ ہو، حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں وہ سماج کا بدترین آدمی ہے: **ولاة الجور شرار الامة.** (گزشتہ حوالہ، ج ۲،ص ۳۰۶، ح ۶۳)؛ ظالم حکمراں امت کے بدترین افراد ہیں۔ اسی طرح وہ حاکم جس کا مقصد حکومت کا حصول ہو اور جب اسے حاصل کرلے تو اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگے اور لوگ اپنے حق کو واپس لینے یا اپنے مقاصد کو بیان کرنے کے لئے اس کے پاس نہ جاسکیں، امام علیہ السلام کی نظر میں وہ بدترین حاکم ہے: **شر الولاة من يخافه البرئ.** (گزشتہ حوالہ، ج ۱،ص ۴۰۳، ج ۱۶) ''بدترین حاکم وہ ہے جس سے لوگ ڈریں''۔

ایک دوسرے مقام پر آپؑ ایسے حاکم کو سب سے بڑا احمق اور بیوقوف بتاتے ہیں: **من اختال فی ولایته ابان عن حماقته** . (گزشتہ حوالہ، ج ۲/ص ۱۸۷، ح ۱۵/۷) ''جو اپنی حکومت کے دوران اپنے آپ کو فریب دے اس نے اپنی حماقت سے پردہ اٹھایا ہے''۔ حتیٰ آپ ایسے افراد کو درندہ حیوانوں سے بھی بدتر جانتے ہیں: **سبع حطوم اکول خیر من وال غشوم ظلوم** . (دستور معالم الحکم، ص/۱۷) پرخور درندہ جانور ظالم حاکم سے بہتر ہے۔

ان تین روایتوں میں ظالم حاکم کی تین صفتیں بغیر کسی دلیل کے نہیں ہیں، ظالم حاکم لوگوں میں بدترین انسان ہے اس لئے کہ وہ حق کو ثابت کرنے اور باطل کو نیست و نابود کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا اور بدترین انسان وہ ہے جو کار خیر اور خدا پسندانہ عمل انجام دینے پر قدرت رکھتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرے یا فقیروں اور محتاجوں کی حاجت روائی پر قادر ہو لیکن اس کے لئے کوئی اقدام نہ کرے۔ صفت حماقت بھی ان پر صادق آتی ہے کہ وہ عقل اور قوت غور و فکر رکھنے کے باوجود اس سے استفادہ نہیں کرتے اس لئے کہ عقل، شرع (قرآن وسنت) کے مانند حکم کرتی ہے کہ حکومت ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے، مقصد اور غایت نہیں۔ جبکہ غیر عاقل اور جاہل انسان اور حضرت علی علیہ السلام کے قول کے مطابق احمق وہ ہیں جو اسے مقصد سمجھتے ہیں اور جب اسے حاصل کر لیتے ہیں تو تکبر اور غرور ان کے پورے وجود کو گھیر لیتا ہے۔ اگر وہ عقلمند ہوتے تو سمجھ جاتے کہ عظمت، برتری اور کبریائی صرف ذات پروردگار سے مخصوص ہے: ﴿ **وله الكبرياء فی السمٰوات و الارض و هو العزيز الحكيم** ﴾. (سورۂ جاثیہ، آیت/۳۷) ''زمین اور آسمان میں کبریائی اور بزرگی صرف اللہ کے لئے ہے اور وہ غالب اور صاحب حکمت ہے''۔ پس متکبر انسان اور مغرور حکمراں اپنی عقل سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنی قوت خیال سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور چونکہ وہ خیالی لوگ ہیں لہٰذا غیر حقیقی امور کو اپنے لئے حقیقی سمجھنے لگتے ہیں اور حکومت کو اپنی ملکیت اور صرف اپنے لئے جاننے لگتے ہیں اور حاکمیت کو جاودانی سمجھنے لگتے ہیں۔ خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے: **ان اللــه لا يحب من كان مختالاً فخوراً** .(سورۂ نساء، آیت ۳۶) بے شک خداوند متکبر اور بڑائی جتانے والے کو دوست نہیں رکھتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں پڑھتے ہیں: ﴿ **ان الله لا يحب كل مختال فخور** ﴾ (سورۂ لقمان، آیت/۱۸) ''بے شک خداوند عالم ہر بڑائی جتانے والے متکبر کو دوست نہیں رکھتا''۔

لیکن ظالم حاکم کو درندہ جانور سے بھی پست قرار دینا، اس کی وجہ یہ ہے کہ درندہ جانوروں کی فطرت میں

درندگی ہے اور ان کی درندگی، ان کی خلقت کے قانون کے تحت غریزی اور ذاتی ہے اور وہ اس صفت میں اپنے لئے کچھ حدود کو پہچانتے ہیں اور چونکہ وہ صاحب عقل نہیں ہیں لہٰذا ان کا عمل اس درجہ برا نہیں ہے۔ لیکن انسان جو صاحب عقل ہے اور اسے چاہئے کہ وہ تمام مواقع پر اپنے ہمنوع افراد کی مدد کرے، ایک ایسی جگہ پہونچ جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے اور اس راہ میں شقاوت کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ ایک ملت کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے تاکہ ان کے حقوق، اموال اور سرمایہ پر قبضہ کرسکے۔ تاریخ میں ایسے ظالم و مستکبر سلاطین اور بادشاہ کم نہیں گزرے ہیں جو بے شمار لوگوں کا قتل عام کرتے تھے تاکہ اپنی حکومت کے حدود کو مزید وسعت دیں۔ اگر درندگی کی صفت انسان کے اندر پیدا ہوجائے تو کوئی بھی درندہ جانور اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس بارے میں بوستان سعدی میں حجاج کی داستان سننے کے لائق ہے: ایک نیک آدمی نے حجاج بن یوسف کا احترام و اکرام نہیں کیا۔ حجاج نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا تاکہ دوسروں میں ایسی جرأت پیدا نہ ہوسکے۔ وہ مرد خدا ہنسا اور پھر رو دیا۔ حجاج نے جب اس کی یہ متضاد حالت دیکھی تو اس سے پوچھا یہ رونا اور وہ ہنسی کس بات پر ہے؟ اس نے جواب دیا: میرا گریہ اس لئے ہے کہ میرے قتل ہوجانے سے میرے چار بچے یتیم ہوجائیں گے اور میری ہنسی اس بات پر ہے کہ میں دنیا سے مظلوم جارہا ہوں، ظالم نہیں۔ حجاج کے سپاہیوں نے اس سے بہت کہا کہ اس شخص کے بہت سے طرفدار اور پیروکار ہیں، ان سے ڈر نیز اس کے بچوں کی خاطر اس پر رحم کر۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی اور اسے قتل کرڈالا۔ (بوستان سعدی، باب اول، ص/۶۳)

ظالم بادشاہوں کے ہاتھوں اس طرح کے قتل اور قتل عام انسان کی درندگی کی آخری حد کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگر انسان عقل سے دور ہوجائے اور خواہشات کا پیرو بن جائے تو وہ اس حد تک پست ہوجاتا ہے کہ ہر جانور سے بھی زیادہ پست ہوجاتا ہے: ﴿ اولئک کالانعام بل هم اضل ﴾ (سورۂ اعراف، آیت/۱۷۹) ''یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی پست ہیں''۔

معاشرہ میں عدل اور ظلم کا تعلق حاکم کے عادل اور ظالم ہونے سے ہے

آیات و روایات کی روشنی میں گناہ دو طرح کے ہیں: کچھ گناہوں کا صرف انفرادی پہلو ہوتا ہے اور شاید ان کے برے اثرات سماج کے دیگر افراد کی نسبت زیادہ تر خود گنہگار کی طرف پلٹتے ہیں اور بعض گناہوں کا اجتماعی پہلو ہوتا ہے اور اس کے برے آثار و نتائج سماج کے دیگر افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

اسی کے مقابلہ میں بعض کار خیر نیکوکار کے رشد و ترقی کا سبب ہوتے ہیں اور بعض انسانی معاشرہ کے ارتقاء کا باعث ہوتے ہیں۔

عدل اور ظلم دو اجتماعی موضوع ہیں۔ اگر افراد بالخصوص سماج کے حکمرانوں میں عدالت ایک عادت بن جائے تو معاشرہ سعادت اور خوشبختی کی طرف رواں دواں ہوگا اور اگر حکمرانوں میں ظلم و خیانت گھر کر جائے تو معاشرہ انحطاط اور نابودی کی طرف چل پڑے گا۔

ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ معاشرہ کی پسماندگی اور بدبختی کا سبب حکام ہیں، لیکن یہ بات جرأت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی سماج میں لوگوں کے انحطاط اور ذلت کی اصلی وجہ اور واقعی سبب اس سماج کے حکام ہیں۔ تاریخ میں انسانی معاشرہ عام طور سے رہبروں اور حکمرانوں کے ذریعہ ترتیب پاتا ہے اور لوگ رعایا کی حیثیت سے ان کے نظام اور قوانین کی پیروی اور اتباع کرتے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ لوگ اپنے حاکموں کے دین کے تابعدار ہیں یا لوگ اپنے آباء و اجداد سے زیادہ اپنے حاکموں سے شبیہ ہوتے ہیں۔

اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک خوبصورت کلام ہے: **قلوب الرعیة خزائن راعیھا فما اودعھا من عدل او جور وجده فیھا.** (مستدرک نہج البلاغہ، ص/۱۸۶)

''رعایا کے دل حکمراں کے خزانے ہیں پس عدالت یا ظلم میں سے جو کچھ بھی وہ اس میں رکھے گا وہ وہی پائے گا''۔

اگر حکام معاشرہ کے افراد کے دلوں میں عدالت کے بیج بوئیں گے تو ممکن نہیں ہے کہ لوگ اجتماعی روابط میں ایک دوسرے کی نسبت یا اپنے حاکموں اور رہبروں کے مقابلہ میں ظلم و زیادتی کو روا رکھیں۔ ظلم و زیادتی، ایک دوسرے کے حقوق کو پامال کرنا اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنا یہ سب معاشرہ میں اسی وقت رائج ہوتا ہے جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے حکام ان کے حق میں ظلم کرتے ہیں یا معاشرہ میں ظلم و زیادتی کو روکنے کے لئے کوئی قانون تدوین اور اجراء نہیں ہوتا۔ پس حکام کا صالح ہونا معاشرہ کی اصلاح میں بہت اثر رکھتا ہے، اگر چہ حاکم کے مقابلہ میں لوگوں کا کچھ فریضہ ہوتا ہے۔ لیکن لوگوں کے مقابلہ میں حاکم کی ذمہ داری بہت سنگین ہے اس لئے کہ قدرت حاکمیت میں منحصر ہوتی ہے لوگوں میں نہیں اور جہاں قدرت انحصار پیدا کرلے وہاں حق و عدل سے انحراف کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آیات و روایات میں معاشرہ کے تمام طبقات کے مقابلہ میں حکمرانوں کی جانب سے عدل و انصاف کے اجراء کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کریم لوگوں کی قضاوت،

حکمیت اور معاملات کو اپنے ہاتھ میں رکھنے والوں کو خطاب کر کے فرماتا ہے: ﴿و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل﴾. (سورۂ نساء، آیت/۵۸) ''جب لوگوں کے درمیان فیصلہ اور حکم کرو تو عدالت سے کام لو''۔ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے: ﴿و ان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین﴾. (سورۂ مائدہ، آیت/۴۲) ''جب فیصلہ کرو تو ان کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ حکم کرو۔ بے شک خداوند عالم عدل و انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

حضرت علی علیہ السلام اس موضوع کی اہمیت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

'''' رعایا کی اصلاح ممکن نہیں ہے جب تک والی صالح نہ ہو اور والی و حاکم صالح نہیں رہ سکتے ہیں جب تک رعایا استقامت و پائیداری سے کام لے۔ اب اگر رعایا نے اپنی استقامت و پائیداری سے حکومت کے حق کو ادا کیا اور والی و حاکم نے عدل و انصاف قائم کر کے رعایا کے حق کی ادائیگی کی تو اس وقت حق لوگوں میں باعزت بن جائے گا، دین کی راہیں استوار ہو جائیں گی ،لوگ صالح ہو جائیں گے ،حکومت کی بقا کے امیدوار ہو جائیں گے اور دشمن مایوس و ناامید ہو جائیں گے۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ/۲۱۶)

آیات و روایات میں حکومت و ملت کا قوام و پائیداری، رہبروں اور امت کی اصلاح، انسانی معاشروں کا ارتقا، سماج کے افراد کا کمال و فضیلت کی راہ میں قدم رکھنا اور ان کا حیوانیت کی سرحدوں سے دور ہونا، یہ سب عدالت کا مرہون منت قرار دیا گیا ہے۔

امام المتقین حضرت علی علیہ السلام اپنے گزشتہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لیکن اگر معاشرہ میں ظلم اور بے عدالتی رائج ہو جائے یعنی حاکم ، رعایا کے حقوق کو ظلم و ستم کے ذریعہ پامال کرے اور رعایا بھی اپنے حکام کے حق ،ان کے دفاع اور حمایت کو ترک کر دیں تو وحدت و یکجہتی ختم ہو جائے گی، ان کے درمیان اختلاف و تفرقہ حکم فرما ہو جائے گا اور ظلم و ستم بڑھ جائے گا ۔ رعایا دینی آداب و احکام سے دور ہو جائے گی اور دین میں بدعتیں ایجاد ہو جائیں گی ۔لوگ ہوائے نفس کے اسیر ہو جائیں گے اور نفسانی شہوتوں کو اپنا پیشوا اور معبود مان لیں گے ۔شرعی احکام و تعلیمات معطل ہو جائیں گے اور اخلاقی بیماریاں پھیل جائیں گی ۔''
(گزشتہ حوالہ)

حضرت علی علیہ السلام کے بیانات اور اپنے گورنروں کے نام آپ کے ارسال کردہ خطوط میں غور و فکر سے یہ

بات واضح ہوجاتی ہے کہ دینی حکومت کی سب سے نمایاں علامت، حاکم کی جانب سے عدل وانصاف کا اجرا نیز دینی معاشرہ کی سب سے واضح نشانی، اجتماعی روابط میں عدل وانصاف کا قیام ہے۔ اگر اسلامی حکومت اور مذہبی سماج میں یہ خصوصیت توجہ کا مرکز نہ ہوتو اس کا اسلامی ہونا مشکوک ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کا ثابت نہ رہ پانا

دینی حکومت پر ہونے والے شبہات واعتراضات میں سے ایک اہم شبہہ اور اعتراض یہ ہے کہ اگر دین اجتماعی نظام پر قادر ہے اور معاشرہ کو چلا سکتا ہے تو حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمہ علیہم السلام معاشرہ کی حاکمیت کو اپنے ہاتھوں میں کیوں نہ لے سکے اور دینی تعلیم کو جاری نہ کر سکے؟! جب دینی رہنما دینی حکومت کو قائم ودائم نہ رکھ سکے تو زمانۂ غیبت میں دینی حکومت کی بات کرنا کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے بیانات کی روشنی میں چند مقدمے کو پیش کر کے ہم اس شبہہ کا جواب دے رہے ہیں:

الف: امام علی علیہ السلام گزشتہ خلفاء کے برخلاف، حکومتی معاملات میں اپنے قریبی ترین افراد کے ساتھ بھی کوئی مسامحہ نہیں کرتے اور غفلت نہیں برتتے تھے اور عدالت کو معاشرہ کے تمام افراد کے لئے جاری فرماتے تھے۔ کمزوروں یہاں تک کہ غیر مسلم افراد کے ساتھ بھی ذرہ برابر ظلم وزیادتی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ آپؑ کے بھائی عقیل کی بیت المال سے مزید حصہ کی درخواست کا قصہ اور آپ کے ملکی حدود میں معاویہ کے سپاہیوں کے ہاتھوں ایک یہودی لڑکی کے پیروں سے پازیب کھینچے جانے کا واقعہ مشہور ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے زیر حکومت وولایت علاقوں میں عدل وانصاف کے قیام اور امن وامان کی فضا قائم کرنے کے اعتبار سے بعض دشمنوں کے اعتراف کے مطابق آپ کی حکومت کی مختصر سی مدت تاریخ کا بہترین دور تھا۔

ب: بیت المال سے استفادہ کرنے اور اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کرنے میں اپنے کارندوں کی کڑی نگرانی کرنا اور انھیں فقیروں اور محتاجوں کے امور کی تحقیق کی طرف متوجہ کرنا آنحضرت کی نظر میں خاص توجہ کا حامل تھا۔

یعنی آپؑ کڑی نظروں سے اپنے کارندوں اور گورنروں کی نگرانی کرتے تھے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ

ایک لمحہ بھی اپنے کام میں غفلت برتیں یا اپنی ذمہ داری سے سرپیچی کریں۔ خطا اور غلطی کے ظاہر ہونے کی صورت میں بغیر کسی مصلحت اندیشی کے پہلے انھیں خبردار کرتے تھے اور تکرار کی صورت میں انھیں معزول کر دیتے تھے۔ امام علیہ السلام کی نظر میں دینی تعالیم کو جاری کرنا، حدود الٰہی کو نافذ کرنا اور شریعت مقدس کی حفاظت کرنا، افراد کی شخصیت کی حفاظت پر مقدم تھا اور آپ کبھی بھی **حکومتی یا شخصی افراد** کی شخصیت کی خاطر دین کو قربان نہیں کرتے تھے بلکہ یہ **شخصی افراد** اور (زیادہ تر) **حکومتی افراد** تھے جو بہت زیادہ اپنی حفاظت کرتے تھے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی منزلت سے استفادہ کرتے ہوئے، دین کو بطور وسیلہ استعمال کریں اور امام علیہ السلام کے عتاب کے مستحق قرار پائیں۔ اس بات کی تائید کے لئے ہم امام علیہ السلام کے برتاؤ کے چند نمونوں کی جانب اشارہ کررہے ہیں:

آپؑ بصرہ میں اپنے گورنر عثمان بن حنیف کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

''امابعد! ابن حنیف! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ بصرہ کے بعض جوانوں نے تم کو ایک دعوت میں مدعو کیا تھا جس میں طرح طرح کے خوشگوار کھانے تھے اور تمھاری طرف بڑے بڑے پیالے بڑھائے جارہے تھے اور تم تیزی سے وہاں پہنچ گئے تھے۔ مجھے تو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ تم ایسی قوم کی دعوت میں شرکت کروگے جس سے غریبوں کو دور کیا جارہا ہو اور جس میں دولت مند مدعو کئے جاتے ہوں۔ دیکھو کہ تم ایسے لوگوں کے یہاں کیا کھا رہے ہو۔'' (نہج البلاغہ، نامہ/۴۵)

ایک دوسرے خط میں عبداللہ بن عباس کے پاس تحریر فرماتے ہیں:

''جیسے ہی امت سے خیانت کرنے کی طاقت پیدا ہوگئی تم نے تیزی سے حملہ کر دیا اور فوراً کود پڑے اور ان تمام اموال کو اچک لیا جو یتیموں اور بیواؤں کے لئے محفوظ کئے گئے تھے جیسے کوئی تیز رفتار بھیڑیا شکستہ یا زخمی بکریوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ پھر تم مسلمانوں کے ان اموال کو حجاز کی طرف اٹھالے گئے اور اس حرکت سے بے حد مطمئن اور خوش تھے اور ان کے لوٹ لینے میں تمھیں کسی گناہ کا احساس بھی نہ تھا۔ وائے ہو تم پر!'' (نہج البلاغہ، ۴۱/)

ایک دوسرے گورنر اشعث بن قیس جسے آپ نے آذربایجان بھیجا تھا، سے فرماتے ہیں:

''تمھارا یہ منصب کوئی لقمۂ تر نہیں ہے بلکہ تمھاری گردن پر امانت الٰہی ہے اور تم ایک بلند ہستی کے زیر نگرانی اس کی حفاظت پر مامور ہو۔ تمھیں رعایا کے معاملہ میں اس طرح کے اقدام کا حق نہیں ہے

''(نہج البلاغہ، نامہ/۵)

آپؑ نے زیاد بن ابیہ جو آپؑ کے گورنر عبداللہ بن عباس کی جانب سے امیری اور سرداری کے لئے منتخب ہوا تھا، کے پاس اس طرح تحریر فرمایا:

''میں اللہ کی سچی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر مجھے خبر مل گئی کہ تم نے مسلمانوں کے مال غنیمت میں چھوٹی یا بڑی کسی قسم کی خیانت کی ہے تو میں تم پر ایسی سختی کروں گا کہ تم نادار، بوجھل پیٹھ والے اور بے ننگ و نام ہو کر رہ جاؤ گے'' (نہج البلاغہ، نامہ/۲۰)

ج: ایک اعتبار سے حضرت علی علیہ السلام کا دور حکومت بہت سخت دور تھا اس لئے دشمنوں نے آپؑ پر تین جنگیں تھوپ دی تھیں۔ ان جنگوں کی شروعات کا اصلی مقصد یا مقام و منزل کا حصول تھا یا قوم کے سرمایہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ۔

د: خود معاویہ اور اس کے کارندوں کی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف وسیع اور مسلسل تبلیغات اور پروپگنڈوں نے لوگوں کے افکار کو منحرف اور گمراہ کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں خاص طور پر آپؑ کی شہامت و شجاعت، ایثار و اخلاص سے آگاہ تھے لیکن ۲۵/سال بعد نئی نسل جو اب جوان تھی اس نے صرف آپؑ کے اوصاف کو سنا تھا اور آپؑ کو کما حقہ نہیں پہچانا تھا اسی لئے معاویہ نے اس نئی نسل کے افکار کو منحرف اور گمراہ کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو آپؑ کی شخصیت کے خلاف پروپگنڈہ کرنے پر لگا دیا اور وہ کافی حد تک اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ امام علیہ السلام معاویہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''تو نے لوگوں کی ایک بڑی جماعت کو اپنی گمراہی سے دھوکے میں رکھا ہے اور اپنے نفاق کے سمندر کی موجوں کے حوالہ کر دیا ہے جہاں گمراہی کی تاریکیاں انہیں ڈھانپے ہوئے ہیں اور شبہات کے تھپیڑے انہیں تہ و بالا کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راہ حق سے ہٹ گئے اور الٹے پاؤں پلٹ گئے اور پیٹھ پھیر کر چلتے بنے اور اپنے بزرگوں پر تکیہ کر بیٹھے اور اسی پر فخر و مباہات کرنے لگے علاوہ ان چند اہل بصیرت کے جو واپس آ گئے۔ انھوں نے تجھے پہچاننے کے بعد چھوڑ دیا اور تیری حمایت سے بھاگ کر اللہ کی طرف آ گئے جب کہ تو نے انہیں دشواریوں میں مبتلا کر دیا تھا اور راہ اعتدال سے ہٹا دیا تھا۔ لہٰذا اے معاویہ! اپنے بارے میں خدا سے ڈر اور شیطان

سے جان چھڑالے کہ یہ دنیا بہر حال تجھ سے الگ ہونے والی ہے اور آخرت بہت قریب ہے ۔'' (نہج البلاغہ، نامہ/۳۲)

آپؑ نے اپنے ایک دوسرے خط میں اس طرح تحریر فرمایا ہے:

'' (اے معاویہ!) تو نے باطل دعویٰ کرنے، جھوٹ اور غلط بیانی کے فریب میں کود پڑنے، اپنی اوقات سے بلند منصب کے اختیار کرنے اور ممنوع چیز کو ہتھیا لینے میں اپنے اسلاف کا راستہ اختیار کرلیا ہے اور اس طرح حق سے فرار کرنے کے لئے اور جو چیز یعنی بیعت تمھارے گوشت وخون سے زیادہ تم سے چمٹی ہوئی ہے اس کا انکار کرنا چاہتے ہو..... (نہج البلاغہ، مکتوب/۶۵)''

معاویہ امام علیہ السلام کی منزلت کو گھٹانے اور آپؑ کی شخصیت کو نیچا دکھانے کے لئے ہر وسیلہ حتیٰ قرآن کی آیات سے سہارا لیا کرتا تھا۔ امام علی علیہ السلام اس راہ میں آیات کی تاویل کے بارے میں اسے مخاطب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' (اے معاویہ!) تو نے تاویل قرآن کا سہارا لے کر دنیا پر دھاوا بول دیا اور مجھ سے ایسے جرم کا محاسبہ کردیا جس کا نہ میرے ہاتھ سے کوئی تعلق تھا اور نہ زبان سے، تو نے اور اہل شام نے اسے میرے سر تھوپ دیا تھا اور تیرے عالموں نے جاہلوں کو اور قیام کرنے والوں نے خانہ نشینوں کو اکسا دیا تھا۔ لہٰذا اب بھی غنیمت ہے کہ اپنے نفس کے بارے میں اللہ سے ڈر اور شیطان سے اپنی زمام چھڑالے۔'' (نہج البلاغہ، مکتوب/۵۵)

ان چار مقدموں کے پیش نظر یہ کہنا چاہئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حکومت کی عظیم ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیتے وقت نہایت توجہ اور ظرافت کے ساتھ عمل کیا اور اسے دینی تعلیمات اور الٰہی دستورات کے نفاذ کا بہترین وسیلہ، مفید ذریعہ اور سب سے موثر سبب جانتے تھے۔ آپؑ اپنے پنج سالہ دور حکومت میں اس اصول سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ چونکہ آپؑ معاشرہ میں دین کو اس کے تمام تر پہلوؤں میں نافذ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے؛ لہٰذا یہ بات کچھ لوگوں کے لئے ناگوار تھی۔ جن کے دلوں میں مال و منصب کی محبت گھر کر چکی تھی، احکام الٰہی کا نفاذ ان کے لئے مشکل تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کچھ خاص امتیازات سے بہرہ مند رہیں اور چونکہ انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنی عمر کا کچھ حصہ بے عدالتی اور تفریق و تبعیض کے ساتھ گذرا تھا اور معاشرتی، سیاسی معیشتی معاملات میں قبائلی رجحانات اور خاندانی روابط کے عادی ہو گئے تھے؛ لہٰذا ایک ایسے حاکم کا اپنے اختیارات کو استعمال کرنا جو

سماج کے افراد کے ساتھ برتاؤ میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا ہوان کے لئے بہت سخت اور دشوار تھا۔اسی لئے انھوں نے ترجیح دی کہ علوی اسلام کی خوبیوں کو پس پشت ڈال دیں اور دینی ظواہر اور عبادت کے پابند بھی رہیں۔پس شیعی حکومت کے مستقر اور پائیدار نہ ہونے کی ایک وجہ لوگوں کی دین کی حقیقی تعلیمات سے بے توجہی اور ان کا دنیا اور مادی آرام وآسایش کی طرف رجحان تھا، حاکمیت کی لاپرواہی نہیں۔

اس بات کی واضح اور گویا دلیل امام علیہ السلام کا وہ کلام زریں ہے جو آپؑ نے اپنے ایک صحابی کی شہادت کے موقع پر فرمایا تھا:

''اور میں نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ جنگ سے پہلے ان کی مدد کو پہنچ جائیں اور انہیں خفیہ اور علانیہ ہر طرح دعوت عمل دی تھی اور بار بار آواز دی تھی لیکن بعض افراد بادل ناخواستہ آئے اور بعض نے جھوٹے بہانے کر دیئے۔کچھ تو میرے حکم کو نظرانداز کر کے گھر ہی میں بیٹھے رہ گئے۔اب میں پروردگار سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے ان کی طرف سے جلد گشائش امر عنایت فرمادے کہ خدا کی قسم اگر مجھے دشمن سے ملاقات کرتے وقت شہادت کی آرزو نہ ہوتی اور میں نے اپنے نفس کو موت کے لئے آمادہ نہ کرلیا ہوتا تو میں ہرگز یہ پسند نہ کرتا کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک دن بھی ان کے ساتھ رہوں یا خود ان لوگوں کی طرف دیکھوں۔'' (نہج البلاغہ، نامہ/۳۵)

ان بیانات کی روشنی میں نہ صرف ایک غیر مسلم دانشور بلکہ عقل و منطق بھی اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ: **قتل علی علیه السلام فی محرابه لشدة عدله؛** امام علی علیہ السلام اپنی شدت عدالت کی وجہ سے محراب میں شہید ہوئے۔

امام صادق علیہ السلام اور آپ کی سیاست

سید نجیب الحسن زیدی

یوں تو لفظ سیاست ایک ایسا لفظ ہے جسے ہم روزمرہ کی زندگی میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں لیکن انسانی علوم میں معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کافی پیچیدہ مانا جاتا ہے۔

اس کی پیچیدگی شاید اس لئے بھی کچھ زیادہ ہے کہ ابھی تک اس کا قلمرو غیر تعین شدہ ہے اور نہیں معلوم کہ اس کی سرحدیں کس مقام پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔[1] اس کے علاوہ شاید سیاسی اور غیر سیاسی امور کے مفاہیم کی مکمل تمیز اور ان کے آپسی رابطے کا مکمل طور پر واضح نہ ہونا بھی اس بات کا سبب بنا ہے کہ عام طور پر لوگ سیاسی اور غیر سیاسی مفاہیم کو آپس میں خلط کر دیں اور اپنے ذہن میں اپنے اپنے طرز تفکر اور اپنی سوچ کے مطابق سیاست کا ایک خاص مفہوم رکھتے ہوں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنے راہنماؤں کی مجاہدانہ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض مقامات پر پہونچنے کے بعد نہیں سمجھ پاتے کہ یہاں پر ان کا فلاں عمل کیوں کر واقع ہوا؟ اس کے پیچھے کون سی تدبیر پوشیدہ تھی اور کون سی حکمت نہاں تھی؟ یا پھر ہم میں سے بعض افراد ائمہ علیہم السلام کی زندگی کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ تک پہونچتے ہیں کہ بنیادی طور پر ان کا سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا جب کہ سیرت معصومین علیہم السلام اور احادیث و روایات کی روشنی میں یہ نظریہ کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتا ہے۔[2] اپنے ذہن میں پائے جانے والے سیاست کے تصور سے قطع نظر اگر ہم اپنے ائمہ علیہم السلام کی زندگی اور اسمیں پائے جانے والے تمام نشیب و فراز کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انہوں نے فلاں کام کیوں انجام دیا تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ واقعی سیاست

سے مراد کیا ہے؟ اور درحقیقت سیاست کا تعلق کن مسائل سے ہے اور س کے ارکان اور دائرہ کار کی حیثیت کیا ہے؟

سیاست کے لغوی معنیٰ

لفظ سیاست عربی میں تدبیر امور۳ مصلحت اندیشی کے ساتھ کام انجام دینے ۴ اور حکومت کرنے ۵ ادارت، عدالت، حراست، تدبیر، تنبیہ، ۶ قوم کے امور کو منسجم کرنے ۷ کے معنی میں بیان ہوا ہے۔

سیاست کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں سیاست کو اس علم سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں انواع ریاست، سیاسیات اور اجتماعیات کے جملہ احوال اور کوائف کے ضروریات سے بحث ہوتی ہے۔۸

سیاست ایسی کارکردگی کو بھی کہتے ہیں جسے ملک، معاشرہ یا کسی تنظیم میں حصول قدرت کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔۹

نیز کلمہ سیاست مخلوق خدا کو راہ نجات کی طرف راہنمائی کرنے (۱۰) یا لوگوں کو اس چیز کی طرف ہدایت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ان کے لئے بہتر ہو(۱۱)۔ یہی معنی دنیا و آخرت کی نجات کے سلسلہ میں بھی بیان ہوئے ہیں ۔۱۲

خدا اور تمام زندہ و مردہ موجودات کے حقوق کے ادا کرنے (۱۳) اور قوم کے امور کی نظارت کو بھی سیاست سے تعبیر کیا گیا ہے ۔۱۴

سیاست کی تعریف اور حقیقت علماء اور دانشوروں کی نظر میں:

- علامہ محمد تقی جعفری: سیاست لوگوں کی اجتماعی زندگی کو ادارہ کرنا اور اسے بہتر بنانے کے لئے ہر اس ممکنہ وسیلہ سے استفادہ جو مقصد کے بہتر طور پر حصول میں مددگار ہو ۔۱۵
- محمد تقی مصباح: سماج کو ادارہ کرنے کا طریقہ کار جس میں معاشرہ کی مصلحتیں مدنظر ہوں۔ ۱۶
- رابرٹ ڈھل (Robert dhal) :سیاسی نظام انسانی تعلقات کا مستقل نمونہ ہے جس میں کنٹرول ،غلبہ(Influence) اور اتھارٹی اہم ہیں ۔۱۷
- سر جان رابرٹ سیلے(Sir john robert seeley):علم سیاست حکومت کے حقائق کی جستجو کرتا ہے۔ جس طرح معاشیات دولت سے تعلق رکھتا ہے بیالوجی زندگی سے الجبرا اعداد سے اور جیومٹری جگہ اور اسکی و

سعت سے۔۱۸

- پروفیسر میکس ویبر (Max weber): علم سیاست ایسا مثبت اور معیار کنندہ (normative) علم ہے جو انسانی زندگی کا تلاش عدل کی حیثیت سے مطالعہ کرتا ہے۔۱۹
- پروفیسر جارج کیٹ لن (George catiline): علم سیاست ایک ایسا مطالعہ ہے جس میں انسانی عمل اور سماجی کنٹرول پر غور رہوتا ہے۔۲۰
- ڈاکٹر علی شریعتی: سیاست: یعنی انسان کی کا اجتماعی شعور اور اپنے اس معاشرے کے بارے میں آگہی و علم جس سے وہ جڑا ہوا ہے (۲۱)
- جواد نوروزی: سیاست: سماج کی ایسے خطوط پر ہدایت اور راہنمائی ہے جن پر چل کر اسے مادی اور معنوی فائدے حاصل ہوں۔۲۲
- ڈیوڈ واسلٹاین: سیاست معاشرہ میں اقدار کا آمرانہ طرز پر تقسیم کرنا ہے ۔۲۳
- ڈکٹر محمد اعظم چودھری: سیاسیات، عمرانی علوم کا وہ حصہ ہے جو ریاست کی نوعیت، ابتداء اور ارتقا اور ریاست وحکومت کی مختلف اشکال اور نکے اغراض ومقاصد، شہریوں کی آزادی، حقوق وفرائض اور ریاستوں کے مابین تعلقات وغیرہ کا مدلل اور سائنٹفک مطالعہ کرتا ہے۔۔۲۴

سیاست کے سلسلہ میں نئے سامنے آنے والے رجحانات کے پیش نظر ڈاکٹر چودھری لکھتے ہیں:

دوسری عالمی جنگ (۴۵۔۱۹۳۹) کے بعد علم سیاست کے مطالعے میں نئے رجحانات منظر عام پر آئے ہیں۔ان رجحانات میں سیاسی کرداریت۔(viouralism political beha) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ہے اس نے سیاسیات کی روایتی تعریف کو بدل کر رکھ دیا ہے اور اس علم کے دائرہ کار کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب علم سیاست سے مراد محض ریاست اور حکومت کا مطالعہ نہیں بلکہ بحثیت مجموعی ''سارے معاشرے کا مطالعہ ہے اور اس میں صرف سیاسی اداروں کے ڈھانچوں کا ہی مطالعہ نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ان اداروں کے افعال و کردار کے علاوہ ان سارے عوامل کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے جو ان اداروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔۲۵

مذکورہ بالا تمام سیاست کی تعریفوں کا نچوڑ امام خمینی کی تعریف میں ملتا ہے آپؒ سیاست کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سیاست یہ ہے کہ سماج اور معاشرے کے تمام پہلوؤں اور اس کے تمام تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اس کی صحیح راہ پر ہدایت کی جائے۔ ۲٦

اس تعریف کی روشنی میں ہم اگر اپنے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک چیز ہمیں محور کے طور

پر قبول کرنا ہوگی اور وہ سماج اور معاشرے کی صحیح راہ پر ہدایت ہے اور چونکہ ہم اپنے تمام ائمہ علیہم السلام کو معصوم مانتے ہیں اور ان سے غلطی کا امکان ہی نہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ سماج اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے جو قدم بھی انہوں نے اٹھایا وہ اس وقت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا، اگر چہ وہ قدم ہماری نظروں میں مبہم ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ یہ نظر کلامی نقطہ نگاہ سے تو قبول ہو سکتی ہے لیکن تاریخی تحلیل اسے قبول نہیں کر سکتی چنانچہ وہ چیزیں جو کلامی نقطہ نظر سے ہم قبول کرتے ہیں اگر تاریخی تحلیل اور تجزیہ کے بعد عقل بھی ان کی تائید کرے تو بعض وہ مقامات جہاں ہمارے ذہنوں میں کچھ ابہامات ہیں وہ دور ہو سکتے ہیں اور اس طرح ہم اپنے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کو ایک بہترین نمونہ عمل اور ایک کامیاب سیاست مدار کے عنوان سے کہ جن کا تمام ہم وغم سماج اور معاشرہ کی اصلاح تھا ساری دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں چنانچہ جیسا کہ عنوان سے واضح ہے کہ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ امام صادق علیہ السلام کی زندگی کا جائزہ اس طرح لیا جائے کہ آپ کی زندگی میں انجام پانے والے مختلف امور میں وہ چیزیں نمایاں ہوں کہ جو آپ کی شفاف سیاست کی بنیا نگزار ہونے کے ساتھ ساتھ ہر اس انسان کے لئے مشعل راہ ہیں کہ جو اپنے سماج اور معاشرے کی بہتری کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام اور آپ کے زمانہ کے سلاطین

آپ کی ولادت باسعادت ۱۷/ربیع الاول ۸۳ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی، ۵/شوال ۱۴۸ھ ۶۵/سال کی عمر میں منصور دوانقی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ۲۷

اور جنت البقیع میں اپنے والد ماجد اور جد بزرگوار کے جوار میں آرام فرما ہیں (۲۸) ۔آپ کی یہ ۶۵ سالہ زندگی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے، جن میں آپ کی زندگی کا ایک حصہ وہ ہے جو اموی سلاطین کے زمانے میں گزرا اور دوسرا وہ ہے جو عباسی عصر میں گزرا۔

اموی خلفا

۱) ہشام بن عبدالملک (۱۰۵ تا ۱۲۵) ۲۹

۲) ولید بن یزید بن عبدالملک (۱۲۵ تا ۱۲۶) ۳۰

۳) یزید بن ولید بن عبدالملک ۱۲۶ ۔۳۱

۴) ابراہیم بن ولید بن عبدالملک (۱۲۶ سے ستر دن) ۳۲

۵) مروان بن محمد (۱۲۶ تا ۱۳۲) ۳۳

عباسی خلفا:

۱)عبداللہ بن محمد معروف بہ سفاح (۱۳۲تا۱۳۷) ۳۴

۲)ابو جعفر معروف بہ منصور دوانقی (۱۳۷تا۱۵۸) ۳۵

آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز اور اس کی خصوصیات:

بچپن سے ہی آپ کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کا لمحہ لمحہ اپنے دامن میں ہزار ہا عبرتیں اور درس لئے ہے۔اس لئے کہ ۱۴سال کے سن سے ہی آپ اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ کے جد بزرگوار امام زین العابدین علیہ السلام کس طرح دعاؤں کے ذریعہ محمد حنفیہ اور ان کے بارے میں امامت کا عقیدہ رکھنے والوں کے خلاف مصروف عمل ہیں۔ ۳۶ تقریبا ۱۲/سال کا عرصہ آپ نے اپنے جد امام سجاد کی تربیت کے سایہ میں گزارا اور ۱۹ سال اپنے والد گرامی کے سایہ شفقت میں گزارے ۳۷ لیکن رسمی طور پر آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز آپ کے جد بزرگوار امام سجاد علیہ السلام اور والد ماجد امام باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد ہی ہوتا ہے جب آپ کے والد کی شہادت ہوتی ہے تو آپ کی عمر مبارک ۳۴/سال سے ۳۷/سال کے درمیان ہے اس طرح اپنے والد کے بعد تقریباً ۲۸/سال کی طولانی مدت آپ نے شیعوں کی سرپرستی اور امامت فرمائی جو کہ دیگر ائمہ کی بہ نسبت طولانی ترین مدت ہے۔۳۸

آپ کا دوران امامت اپنی زمانی خصوصیت کی اعتبار سے ایک بے نظیر دور ہے استاد شہید مطہری آپ کے دور کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''اس نکتہ کا بیان کرنا ضروری ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے آپکا زمانہ اپنے آپ میں منحصر دور ہے، یہ دور تحریکوں اور فکری انقلابات کا دور ہے.. اسپین اسی زمانے میں فتح ہوا۔۔۔ اسلامی فتوحات کو قریب ایک صدی گزر چکی ہے مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والی ۲ یا تین نسلیں جہان اسلام میں نو وارد مسلمانوں کی حیثیت سے وارد ہو چکی ہیں بنی امیہ کے دور سے کتب کے ترجمہ کا کام شروع ہوا اور مختلف تہذیب و ثقافت کے حامل اقوام اسلام میں شامل ہوئے ، زنادقہ جو کہ خدا و پیغمبر (ص) کے منکر تھے اسی دور میں سر اٹھایا تصوف بھی نئے انداز سے اسی دور میں سامنے آیا اسی طرح اپنے مخصوص نظریات کے ساتھ مختلف فقہاء بھی اسی دور میں وجود میں آئے مختصر یہ کہ اس دور میں دنیائے اسلام میں اس قدر فکری اختلافات سامنے آئے جنکی مثال اس سے قبل کہیں نہیں ملتی ہے''

آپ ہی کے دور کی خصوصیت ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ تمام وہ افراد جو خلافت اور حکومت

کے طالب تھے ایک ساتھ حرکت میں آ گئے اور اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی حالات کا رخ دیکھتے ہوئے آپ نے مکتب اہلبیت علیھم السلام کی فقہی بنیادوں کی تعمیر کو دیگر امور پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے آپ کو اس طرح اس دور کی نام نہاد سیاسی شخصیات سے الگ کرلیا کہ کوئی آپکے نام کو اپنے مفاد کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

''ظاہری سیاسی چپقلش کے ساتھ عقائد و افکار کی کی جنگ بھی اس دور میں اپنے عروج پر تھی کلامی مباحث کی گہما گہمی تھی ایسے حالات میں معقولات کی وادی میں مکتب امامیہ کا ضابطہ مندورود آپ ہی کی علمی کاوشوں کا رہین منت ہے یہی وجہ ہے کہ آپکو مدارس علوم عقلی کا موسس و بانی کہا گیا ہے''۔ ۳۹

آپ کی فعالیت کا نقطہ عروج

آپ کی فعالیت کا نقطہ اوج آپ کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب بنی امیہ کی حکومت کا زوال اور بنو عباس کا اقتدار پر قبضہ ہوا چاہتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہیں۔

چنانچہ آپ نے بنی امیہ اور بنی عباس کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کے درمیان نصیب ہونے والے وقت سے مکمل فائدہ اٹھایا اور ایک ایسی دانشگاہ کی تاسیس کی کہ جسمیں ہزار ہا تشنگان علوم و معارف آ کر اپنے علم کی پیاس بجھاتے تھے۔

آپ نے اس دوران مختلف عقلی اور نقلی موضوعات میں برجستہ شاگردوں کی تربیت اس انداز میں کی کہ ہر ایک اپنے میدان میں لاثانی نظر آتا ہے آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار سے زائد بیان کی گئی ہے (۴۰) جن میں جہاں ہشام بن حکم،، ابان بن تغلب، ہشام بن سالم، مومن طاق، مفضل بن عمر اور زرارۃ بن اعین جابر بن حیان، جیسے اسامی سرفہرست ہیں وہیں محمد بن مسلم جیسے مختلف علوم میں ۱۶ ر ہزار سے زائد احادیث نقل کرنے والے افراد بھی شامل ہیں۔ ۴۱

آپ کی عظیم یونیورسٹی کی افادیت اور اس کی عظمت کسی پر پوشیدہ نہیں، شیعہ اور سنی دونوں ہی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد اس کی بے لوث خدمات کا کلمہ پڑھتے ہیں اور دونوں ہی مذاہب کے ماننے والے اسلامی علوم کی تمام تر ترقی کو آپ ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ۴۲

آپ کی عظیم یونیورسٹی کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ بات غلط نہیں ہے کہ تمام علوم کو آپ ہی کی طرف منسوب کیا جائے یا احیاء تراث اسلامی کا سہرا آپ ہی کے سر باندھا جائے کیونکہ آپ کے علاوہ اور کوئی دوسری شخصیت تاریخ اسلام و ادیان میں نظر نہیں آتی جس کے فیوضات سے ہر مکتب و مسلک اور ہر قوم و قبیلہ کے لوگوں نے

بہ یک وقت استفادہ کیا ہو۔ چنانچہ آپ کے شاگرد صرف آپ کے ماننے والے شیعوں تک محدود نہیں تھے بلکہ آپ کے شاگردوں میں ان افاضل کا نام بھی نظر آتا ہے جو اپنے اپنے علاقے میں اپنی ایک حیثیت اور پہچان بنانے کے باوجود آپ کے در پر علم کی خیرات لینے آتے تھے۔

مذاہب اربعہ کے تمام ائمہ باواسطہ یا بدون واسطہ آپ کے شاگرد رہے ہیں۔۴۳؎

دیگر مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد میں سب سے ممتاز نام ابوحنیفہ کا نظر آتا ہے جنہوں نے آپ کی علمی لیاقت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہیں آپ کو افقہ کے لقب سے یاد کیا ۴۴؎ تو کہیں صحیفہ احادیث سے تعبیر کیا ۴۵؎ تو کہیں آپ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اعلان کیا کہ آپ سے زیادہ، اختلافی آراء کا جاننے والا اور کوئی نہیں ہے ۴۶؎ اور دو سال آپ کی شاگردی میں رہنے کے بعد ان دو سالوں میں آپ کے گہربار اثرات نے انہیں اس قدر متاثر کیا کہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر یہ دو سال نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔۴۷؎

آپ نے اپنے علم و فضل، عبادت اور تقوی کا لوہا اس طرح منوایا کہ ہر ایک آپ کا قصیدہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے چاہے وہ، مکتب مالکی کے امام مالک ہوں (۴۸) اہل سنت کے معروف عالم دین جاحظ ۴۹) اور شہرستانی (۵۰) ہوں یا ان کے مشہور مورخ ابن خلکان (۵۱) ہر ایک نے آپ کو کسی نہ کسی طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

آپ کی یونیورسٹی کے عمومی فیوضات

جیسا کہ بیان ہوا اس دانشگاہ اور یونیورسٹی میں جو ہر علم سے مالا مال ہونے والے صرف شیعہ ہی نہ تھے بلکہ دوسرے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اس میں شامل تھے جو اپنے علم کی پیاس بجھانے **باب مدینة العلم** کے فرزند کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے خود کو علم کی بیش بہا دولت سے مالا مال کر رہے تھے۔

امام علیہ السلام نے بغیر کسی مسلک و مذہب کی قید لگائے قوم، مذہب، رنگ، نسل، سے ماوراء ہو کر اپنے سامنے ہر دامن نیاز پھیلانے والے کے دامن کو علم و حکمت کے گوہروں سے بھر کر بتایا کہ میری ذمہ داری کسی خاص طبقے تک محدود نہیں اور ہر حاجت طلب کرنے والے کی حاجت روائی ہمارا فرض ہے اور خلق خدا کی ہدایت و رشادت ہی ہماری سیاست ہے نہ صرف آپ اپنے ماننے والوں کی علم کی بھیک دیتے نظر آتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی انکے مذہب اور انکے عقیدہ کے حساب سے جواب دے کر مطمئن کر دیتے ہیں چنانچہ حیرہ کے ایک سفر کے دوران امام ابوحنیفہ نے منصور کے حکم سے امام سے ۴۰ سوال کئے امام نے تمام کے تمام کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ تمہارا اس مسئلہ میں یہ عقیدہ ہے اہل مدینہ اسی مسئلہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں، اسی مسئلہ میں ہمارا نظریہ یہ ہے کبھی اہل مدینہ

ہمارے قول پر ہمارے ساتھ ہو جاتے ہیں تو کبھی ہم اہل مدینہ کے ساتھ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارا مسئلہ تم سب سے الگ ہوتا ہے ۔۵۲ اسی گفتگو کے بعد ابو حنیفہ نے یہ معروف جملہ کہا تھا کہ میں نے جعفر بن محمد سے زیادہ افقہ کسی کو نہیں پایا۔۵۳

اگر وسیع القلبی سے امام صادق علیہ السلام کی اس عظیم یونیورسٹی کے فیوضات و برکات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ امام علیہ السلام نے نہ صرف اپنے ماننے والوں کے لئے بلکہ پورے عالم اسلام بلکہ پوری بنی نوع بشر کے لئے دریچہ ہائے فکر و نظر اور علم و ہنر کو وا کر دیا تھا جس سے کوئی ایک قوم، ایک مذہب نہیں بلکہ پورا عالم انسانیت فیض حاصل کر رہا تھا۔ علم نجوم ہو ۵۴ کہ علم اقتصاد، علم جغرافیا و کیمیا (۵۵) ہو کہ علم طب، ۵۶ فلسفہ ہو کہ ریاضی و ہندسہ ۵۷ تاریخ ہو کہ علم کلام و اجسام، علم ابدان ۵۸ ہو کہ شہود و عرفان، غرض کہ ہر علم میں خاص تبحر اور مہارت رکھنے والے آپ کے شاگرد موجود تھے جن کی تالیفات اور تجارب بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے اور سائنس و ٹکنالوجی کے ذریعہ جن کی روشنی میں سرعت عمل کے ساتھ ان چیزوں کا انکشاف وجود میں آیا جو آج انسانیت کی اولین ضرورتیں بن کر اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی ہیں۔۵۹

یونیورسٹی کا قیام، سیاسی نقطہ نظر سے

نہ کوئی آپ کی قائم کردہ یونیورسٹی کی افادیت کا منکر ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے تا دم قیامت باقی رہنے والے اثرات پر اعتراض کر سکتا ہے لیکن بقول ''استاد پیشوائی'' امام علیہ السلام کی زندگی میں پائے جانے والے نشیب و فراز کی موشگافی کرنے والوں کی نظر سے جو بات پوشیدہ رہ گئی وہ آپ کی یونیوسٹی کے قیام کا سیاسی مفہوم ہے کہ امام علیہ السلام نے اتنی بڑی یونیوسٹی قائم کر کے نہ صرف اپنے علم و فضل بلکہ اپنی دور اندیشی اور سیاست کا بھی لوہا منوالیا (۶۰)۔ مسند درس پر بیٹھ کر ہزار ہا تشنگان علم و حکمت کے سامنے جو چیزیں بھی آپ بیان فرما رہے ہیں ظاہر ہے جہاں تک ان کا تعلق اعتقاد اور احکامات سے ہے تو بیان ہونے والی تمام چیزیں وہ ہیں کہ جو مکتب اہلبیت علیہم السلام کے نقطہ نظر سے بیان کی جا رہی ہیں۔

اور یہی امام علیہ السلام کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ معارف جو اب تک بعض سیاسی مجبوریوں یا زمانے کے حالات کی بنا پر بیان نہ ہو سکے تھے آپ انہیں مسند درس سے با آسانی بیان فرما رہے ہیں اور جہاں یہ معارف آپ کے ماننے والے ضبط و ثبت کے ذریعہ آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر رہے ہیں وہیں دوسرے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر حقیقت تشیع واضح ہو رہی ہے۔

چنانچہ آپ نے مکتب تشیع کے معارف کو اس کی کامل ترین صورت میں بیان تو کیا ہی ساتھ ساتھ ان خرافات کا سد باب بھی کر دیا جو ممکنہ طور پر اس میں بعض کج فکر افراد کی بنا پر داخل ہو سکتی ہیں۔

اور اس زمانے کی خاص فضا کو دیکھتے ہوئے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس یونیورسٹی کا قیام کس قدر ضروری تھا کہ جو دین پر ہونے والے اعتراضات کے سامنے نہ صرف یہ کہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر سکے بلکہ اس میں علم حاصل کرنے والے آپ کے خاص شاگرد قریہ قریہ اور شہر شہر جا کر لوگوں پر واضح کریں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ ان ہنگامی حالات میں ان کا عملی موقف کیا ہونا چاہئے؟

اگر تحمل و بردباری و دقت نظر کے ساتھ آپ کی مجاہدانہ زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے خاص حالات کو دیکھتے ہوئے کہ جن کا ذکر آگے آئے گا امام علیہ السلام نے قوم و ملت کی ہدایت کے لئے جن شیوؤں کا انتخاب کیا تھا وہ کس قدر مثمر ثمر واقع ہوئے۔

مختلف و متعدد پیدا ہونے والے مسائل اور روز مرہ سامنے آنے والی مشکلات سے نمٹنے کے لئے امام علیہ السلام نے جس سیاست کو اپنایا تھا یقیناً اس کے علاوہ ہر سیاست اس وقت کے خاص حالات کے مدنظر پہلے ہی سے قرین بہ شکست تھی۔

یہ بات اس وقت مزید روشن ہو جاتی ہے جب ہم اس زمانے کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہر چیز سے زیادہ اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز حیات کو پہچنوانے کی ضرورت تھی کیونکہ بنوامیہ کے حکومت سے رخت سفر باندھنے کے بعد جو نسبی آزادی مسلمانوں کو نصیب ہوئی تھی اسمیں مختلف نظریات اور آراء کا تبادل ہو رہا تھا دوسرے مذاہب کی مختلف دینی و فلسفی کتابیں بازار میں عام لوگوں کی دسترس میں تھیں ۔(۶۱) یہ وہ دور تھا جہاں مکتب امامیہ کے کلامی مباحث میں صرف امامت کو لیکر گفتگو نہیں ہو رہی تھی بلکہ توحید سے لیکر امامت، معاد، قضا و قدر، خلقت کائنات و.. جیسے تمام مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی ہشام بن حکم کی جانب سے ثنویت سے مربوط مباحث اور ارسطو کے فلسفی دلائل و براہین کا دانداں شکن جواب (۶۲) س بات کی دلیل ہے کہ اس دور میں کس قدر وسیع پیمانے پر نظری مباحث وجود میں آرہے تھے ۔

امامؑ نے ایسے دور میں جہاں اسلامی اور نبوی حقیقی طرز زندگی کا تعارف کرایا وہیں شیعہ متکلمین کو بھی زیادہ سے زیادہ کلامی مباحث میں کام کرنے کی ترغیب دلائی چنانچہ آپکی سیرت میں ملتا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنے ان شاگردوں کو جو علم کلام میں مہارت رکھتے تھے خاص طور پر ہشام بن حکم اور مومن طاق کو اس بات پر وادار کرتے رہتے تھے کہ وہ کلامی مباحث پر لگن سے کام کرتے رہیں (۶۳) حتی نہ صرف آپ نے کلام کے بنیادی اصول اور مناظرہ

کے قواعد سے اپنے شاگردوں کو آگاہ کیا بلکہ مناظرہ کی کیفیت اور اسکے انداز، اور طریقہ کار کو بھی انہیں تعلیم فرمایا۔[٦٤]

نظری اور کلامی مباحث کے ساتھ ساتھ اس دور بہ کثرت احادیث نقل ہو رہی تھیں کہ جن کی جانچ پڑتال اور چھان بین ایک مشکل امر بن چکا تھا، مختلف تہذیبیں سامنے آرہی تھیں جگہ جگہ مناظرے ومباحثے ہو رہے تھے چنانچہ ''ڈاکٹر حاتم قادری'' اس زمانے کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''جن لوگوں نے اس وقت کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور بغداد و دیگر بڑے شہروں میں ہونے والے مختلف کلاس، فقہی اور فلسفی جلسوں سے آشنائی رکھتے ہیں وہ اموی اور عباسی حکومت کے مابین فرہنگی وثقافتی اختلافات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے... حکماء، اطباء، ادبا اور فقہا کی اپنے اپنے میادین میں زبردست فعالیت اس دور کے فرہنگ وتمدن کی سطح کی بیان گر ہے۔[٦٥]

بنی امیہ اور بنی عباس کی آپسی چپقلش کی بنا پر سیاسی فضا کافی بسیط ہوگئی تھی امام نے اپنی حکومت کے سلسلہ میں اس سے استفادہ کیوں نہیں کیا اس کی وجہ کیا تھی ؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس سے صرف نظر کیا جاتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ظاہری طور پر فضا پہلے کی طرح اب مسموم نہیں تھی اس میں پہلے جیسی گھٹن نہ تھی (٦٦) چنانچہ مختلف مکاتب فکر وجود میں آرہے تھے، علم کلام کی بحثیں گرم تھیں، فلسفی اور دیگر کتابیں عربی میں ترجمہ ہو رہی تھیں معقولات کی طرف لوگوں کا رجحان قابل دید تھا اگر چہ یہ کھلی فضا تادیر قائم نہ رہ سکی ٦٧) اور منصور دوانقی نے اپنی جنایتوں اور شاطرانہ چالوں سے اسے پھر مکدر بنا دیا۔[٦٨]

لیکن بہر حال ایک مختصر عرصہ ہی کے لئے سہی لیکن ایک ایسی فضا ضرور قائم ہوئی کہ جہاں نظریوں کے تصادم کی جگہ تبادل اور مار کاٹ کی جگہ بحث ومباحثہ اور لڑ جھگڑ کر اپنی بالادستی منوانے کی جگہ علمی میدان میں مقابل کو زیر کر کے لوہا منوانے جیسی چیزوں نے لے لی تھی۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے جن کا اجمالی خاکہ ہم نے پیش کیا سب سے بہترین عمل اپنے شاگردوں کی تربیت کے ساتھ ایک ایسی یونیورسٹی کا قیام تھا کہ جس کے ذریعہ شیعیت اور مکتب اہلبیت کی اساس اور بنیاد بھی مضبوط ہو ساتھ ہی دوسرے مکاتب فکر کے شبہات کا جواب بھی دیا جا سکے چنانچہ امام علیہ السلام نے اپنے اطراف و اکناف کے تمام جوانب کا بغور جائزہ لے کر یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں جو اقدام کیا یقیناً ایسا کام ہے جس کے فوری اور طویل مدت دونوں ہی ثمرات اس اقدام کے اپنی نوعیت میں یکتا ہونے پر بارز دلیل ہیں۔

کتابت احادیث اور تالیف کتب

یونیورسٹی کی تاسیس کے علاوہ آپ کا دوسرا اہم کام احیاء احادیث تھا۔

یہ وہ کام تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے باطل کے اوپر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے انشاء اللہ آگے اس عمل کی سیاسی افادیت کو بیان کیا جائے گا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نشر احادیث کے لئے آپ نے جو جدوجہد کی وہ بے نظیر ہے اور صاحبان نظر پر اس کی ارزش واضح ہے۔ ۶۹

آپ نے صرف مکتب تشیع کی فقہی میراث احادیث وروایات کو ہی از سر نو زندہ نہیں کیا بلکہ ان کے انتشار کو وقت کی ضرورت کے پیش نظر اپنا اولین وظیفہ سمجھتے ہوئے اسے بخوبی نبھایا اور احادیث وروایات کے سلسلہ میں ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ جس کے ذریعہ اگر کسی نے مستقل طور پر آپ سے احادیث نہ بھی سنی ہوں تو انہیں نقل کر سکے تا کہ حدیث کی اور بھی وسیع پیمانہ پر نشر واشاعت ہو سکے۔

چنانچہ آپ نے اپنے بعض شاگردوں کو اجازہ نقل روایت دیا۔ صاحبان نظر پر یہ پوشیدہ نہیں کہ نشر احادیث کا ایک بہترین وسیلہ اجازہ ہے جو کہ مسلمانوں کی علمی اور فرہنگی محافل میں ایک معتبر حیثیت کا حامل ہے۔

کتب احادیث میں اجازہ کی افادیت پر اور اس کے عمومی طور پر مرتب ہونے والے اثرات کے پیش نظر بہت سارے ایسے افراد کے اسامی نظر آئیں گے جنہوں نے صرف ایک اجازہ حاصل کرنے کے لئے بے شمار مشقتیں برداشت کیں۔ ۷۰

(اجازہ کی بحث ایک فنی اور علمی بحث ہے جو علم درایہ اور حدیث سے تعلق رکھتی ہے اور فی الحال ہمارے ملحوظ نظر نہیں ہے) گرچہ بعض علماء کے یہاں اجازہ کے بغیر نقل شدہ حدیث ساقط اعتبار ہے اور اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور بعض اسے صرف تیمّن اور تبرک کی حد تک ہی قبول کرتے ہیں (۷۱) لیکن امام علیہ السلام نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر اسلامی معارف کی ترویج کا کام اپنے قابل اعتماد شاگردوں کو اجازہ نقل حدیث دے کر لیا کہیں اپنے شاگرد کو اجازہ عطا کرتے ہوئے فرمایا ''ابان بن تغلب کے پاس جاؤ انہوں نے مجھ سے بہت ساری روایات سنی ہیں وہ تم سے جو بھی نقل کریں تم انہیں میرے نام سے لوگوں میں بیان کر سکتے ہو'' ۷۲ تو کہیں فیض بن مختار سے کہا ''جب بھی تمہیں ہماری احادیث کی ضرورت ہو تم زرارۃ بن اعین کی طرف رجوع کرو'' (۷۳) ظاہر ہے آپ اپنے شاگردوں کی طرح آزادی کے ساتھ ہر جگہ نہیں جا سکتے تھے اور سلاطین وقت کی نظریں آپ کی ہر حرکت پر تھیں

تو اس سے بہتر راستہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اپنے شاگردوں پر اعتماد کرتے ہوئے انکی ایسی تربیت کی جائے کہ لوگ بغیر کسی تامل کے شاگردوں سے سنی ہوئی باتوں پر ویسے ہی عمل کریں جیسا کہ آپ سے سنی ہوں چنانچہ ابی عمیر سے روایت ہے کہ میں نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا ''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کسی مسئلہ کا علم نہیں ہوتا اور ہماری آپ تک رسائی بھی نہیں ہوتی ایسے موقعوں پر ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایسے موقعوں پر ابوبصیر اسدی کی طرف رجوع کرو(۷۴) اسی طرح معروف راوی عبداللہ بن ابی یعفور نے امام کی خدمت میں عرض کی: ہمارے لئے ہر وقت آپکی خدمت میں حاضر ہونا ممکن نہیں ہے جبکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ میرے پاس ایسے مسائل لے کر آتے جنکے جوابات مجھے معلوم نہیں ہوتے ایسے موارد میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

امام نے جواب دیا: محمد بن مسلم کی طرف رجوع کرو انہوں نے میرے والد بزرگوار سے بھی احادیث سنی ہیں اور وہ میرے بابا کے نزدیک صاحب شرف تھے(۷۵) اس کے علاوہ کتابت حدیث کے لئے اپنے تمام شاگردوں اور شیعوں کو اس بات کا پابند بنایا کہ جس قدر ہو سکے احادیث کو سن کر صرف ذہن میں نہ رکھیں بلکہ انہیں مکتوب بھی کرتے جائیں۔۷۶

اور باوجود اس کے کہ آپ کی تمام احادیث آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آپ کے شاگرد کتابت کے ذریعہ محفوظ کر رہے تھے آپ نے اس عظیم کام کو صرف اپنے شاگردوں پر ہی نہ چھوڑا اور خود بھی کمر ہمت باندھ کر مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔

آپ کی کتب:

الاهليجة فى التوحيد (۷۷؛ التوحيد ۷۸)؛ رسالة فى وجوه معايش العباد (۷۹)؛ الجعفريات (۸۰)؛ رسالة فى الغنائم (۸۱)؛ الرسالة اهوازية (۸۲)؛ کتاب الحج (۸۳) الفضائل، کتاب الامامة وغیرہ کے علاوہ اور بھی دوسری کتب جو آپ سے منسوب ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''**تدوين السنة الشريفة**'' ص/۱۶۷.

شہید اولؒ آپ کی ان کتب کی تعداد جنہیں آپ نے پوچھے گئے سوالات کے جوابات کے طور پر تالیف کیا تھا ۴۰۰۰ تک بیان فرماتے ہیں۔۸۴

اگر آپ کی تالیف کردہ کتب اور وہ کتب جنہیں آپ کے شاگردوں نے تالیف کیا ہے(۸۵) ملایا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے ایک قلیل عرصہ میں کتنا بڑا کام انجام دیا ہے، ایسا کارنامہ کہ جس کی نظیر تاریخ

بشریت میں نہیں ملتی۔

آپ نے احادیث اور درس و بحث کے ذریعہ ان تمام موضوعات پر قوم کے لئے مواد فراہم کر دیا جس کی اس کو ضرورت پڑ سکتی ہو۔

اس کام کے سیاسی پہلو کو اگر سمجھنا ہے تو اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ امام علیہ السلام تمام حالات کا باریکی سے جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہ بنیادی کام نہ ہوا تو دوسرے مکاتب فکر کی طرح مکتب تشیع میں بھی وہ خرافات وارد ہو سکتی ہیں جو دوسرے مسالک کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔(۸۶) اور یہیں سے امام علیہ السلام کی سیاسی بصیرت، تدبیر عمل اور سوج بوجھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر بقدر کافی قوم کے حوالے دین کے حقیقی معارف نہ کئے گئے ہوتے تو کس قدر خرافات، دین ہی کے نام پر دین میں داخل ہو گئیں ہوتیں؟۔

اس لئے کہ اگر کسی ایک مسئلہ میں دینی معارف موجود نہ ہوتے تو لوگ مجبوراً اپنے عقلی استنباط کو قرآنی حکم سمجھ کر قبول کرتے۔ چاہے وہ استنباط قرآنی نقطہ نظر سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہوتا ۸۷ اور شاید یہی وجہ ہے کہ دوسرے مکاتب فکر اپنے یہاں نصوص کی قلت کا رونا روتے ہیں لیکن بحمد اللہ ہمارے یہاں اس قدر احادیث و روایات کا ذخیرہ ہے کہ ہمیں من گھڑت قواعد بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ۸۸

بحرانی حالات میں آپ کی حکمت عملی:

آپ جہاں مختلف علوم میں ماہر افراد کی تربیت کر رہے ہیں تا کہ وہ اپنے موضوعات میں اس قدر مہارت حاصل کر لیں کہ مختلف اسلامی مسائل کے سلسلہ میں ہر ایک کو آپ کے پاس نہ آنا پڑے اور وہ اپنے مسئلہ کا حل آپ کے شاگردوں سے دریافت کر لے تا کہ مختلف عمومی مسائل کے استفتاءات میں صرف ہونے والے وقت کو کسی تعمیری کام میں لگایا جائے وہیں آپ کو اپنا کافی وقت ان نت نئے پیدا ہونے والے مسائل میں لگانا پڑ رہا ہے جن کے بارے میں پہلے سے ظاہری طور پر کوئی احتمال نہیں تھا کہ وہ یونہی آپ کے اہداف میں خلل ڈال سکتے ہیں۔

متعدد نئے نئے فرقہ پیدا ہو رہے ہیں، آئے دن ایک نیا فرقہ اپنے وجود کے اعلان کے ساتھ اپنے رہبر اور راہنما کا پرچم لئے اپنے مسلک کی تبلیغ و ترویج کرتا نظر آ رہا ہے، حد یہ ہے کہ زندیق و غالی افراد بھی مسجد الحرام میں بیٹھ کر آزادانہ اپنے نظریات کا نہ صرف کھلم کھلا اعلان کر رہے ہیں بلکہ سست اور ناپختہ دلائل سے اس کی حقانیت کو ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ ۸۹ اور نہ صرف زنادق اور غلاۃ بلکہ جارودی، ۹۰ سلیمانی، ۹۱ صالحی، ۹۲ بتری، ۹۳ یعقوبی، ۹۴ خطابی، ۹۵ اراوندی، ۹۶ علائی، ۹۷ قاسمی، ۹۸ نصیبی، ۹۹ سرخابی ۱۰۰ اور اس طرح کہ نہ جانے کتنے فرقے

اپنے اپنے ماننے والوں کے درمیان بزعم خود بساط ہدایت بچھائے سیدھے سادے لوگوں کو بہکانے کے لئے چوکنے بیٹھے ہیں، ایسے میں حق کا راستہ دکھانا کتنا کٹھن اور سخت ہے ہر فرقہ سے زیادہ جو چیز اسلام کو ایسی صورت حال میں نقصان پہونچا سکتی ہے وہ غلو ہے، چنانچہ کتب تاریخی اس بات پر شاہد ہیں کہ ساتھ آپ نے غالیوں کے خلاف جو موقف اختیار کیا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔۱۰۱

آپ نے ان سب کو واضح لفظوں میں کافر قرار دیتے ہوئے۱۰۲ اپنے شیعوں سے فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست مت کرو، ان کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ نہ بنو۔۱۰۳ اور ان کو زمین پر خدا کی سب سے بدترین مخلوق قرار دیتے ہوئے۱۰۴ صراحت کے ساتھ ان کے سرغنہ کو ملعون قرار دیا اور فرمایا کہ میں اس سے بیزار ہوں۔۱۰۵

ان سے اظہار بیزاری اور عدم مجالست کے حکم پر ہی آپ نے اکتفا نہ کیا بلکہ آنے والے زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی روایات کو قبول نہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا ''ہماری صرف ان باتوں پر عمل کرو جو قرآن و سنت سے مطابقت رکھتی ہوں یا پھر ہماری سابقہ احادیث ان کی تائید کرتی ہوں، پس مغیرہ بن سعید نے وہ باتیں جو ہماری طرف منسوب کی ہیں جنہیں ہرگز ہم نے بیان نہیں کیا ہے''۱۰۶ یا پھر ایک جگہ فرماتے ہیں ''ہمارے اصحاب کی کتب میں جہاں کہیں بھی غلو کے خد و خال نمایاں ہوں پس یہ وہی چیز ہے جسے مغیرہ بن سعید نے اضافہ کیا ہے۔''۱۰۷

امام علیہ السلام نے صریح لفظوں میں غالیوں اور ان کے سرکردہ راہنما سے اظہار برات کر کے اپنے شیعوں کو ان سے بالکل ممتاز شکل میں پیش کر کے یہ بتا دیا ہے کہ ہمارے شیعہ ان باتوں سے مبرا ہیں جو ان کے بارے میں کی جاتی ہیں اور آپ نے اس اظہار برات و بے زاری کے اعلان کے لئے ہر وہ ممکنہ طریقہ اپنایا جس سے لوگوں پر واضح ہو جائے کہ غالیوں سے شیعوں کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔

امام علیہ السلام اس مسئلہ میں اس لئے بھی زیادہ حساس ہیں کہ اس وقت غالیوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ غلو کے حربے سے شیعوں میں نفوذ پیدا کر سکیں اور اس طرح شیعیت کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے میں کامیاب ہو جائیں، کیونکہ ان کا طرز تفکر ایک طرف تو آپسی انتشار و خلفشار کا سبب بن رہا تھا دوسری طرف عمومی طور پر شیعوں کو بدنامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔۱۰۸

چنانچہ اس بدنامی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی اکثر علماء اور رجال اہل سنت شیعوں اور غالیوں کے درمیان کسی خاص قسم کے فرق کے قائل نہیں ہیں اور اس بدبینی کا بارز نمونہ تحریف قرآن کے سلسلہ میں وارد

ہونے والی وہ روایات ہیں جو قرآن میں تحریف کا اثبات کرتی ہیں جن کا اصلی سرچشمہ غلات ہیں۔۱۰۹

چنانچہ غالیوں کے ساتھ امام علیہ السلام کے شدید ردعمل نے یہ واضح کردیا کہ شیعہ غالیوں سے بیزار ہیں حتی ان کے یہاں غالیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو بھی درست نہیں سمجھا جاتا ہے اور کہاں یہ کہ ان کا عقیدہ غلات سے متاثر ہو۔

امام علیہ السلام نے نہ صرف اپنے شیعوں کو عدم مجالست کا حکم دیا بلکہ ان کے سرکردہ کا نام لے کر فرمایا اس شخص کی بات کو قبول نہ کیا جائے، اپنے اس عمل سے امام علیہ السلام نے ممکنہ طور پر شیعیت کو پہونچنے والے ہر آسیب کا سد باب کردیا اور دنیا پر واضح کردیا کہ شیعہ ایک منطقی طرز تفکر رکھنے والا استدلالی مکتب ہے۔

دینی تحریف اور بدعتوں سے مقابلہ

امام صادق علیہ السلام نے نہ صرف علمی، فرہنگی اور تربیتی محاذ پر موثر اقدامات انجام دئے اور علمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مکتب تشیع کو ایک غنی مکتب فکر بنانے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا بلکہ اس دوران رائج ہونے والی بعض اصطلاحات کے سامنے بھی مخالفانہ رویہ اپنا کر ان چیزوں کو فقہ تشیع میں داخل ہونے سے بچالیا کہ جو دوسرے مکاتب فکر میں ایک مستقل مبنی کی حیثیت سے پہچانی جارہی تھیں۔۱۱۰

اگر آپ نے اپنے شیعوں کو بدعت گزار لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست کرتے ہوئے دیکھا تو انہیں خبردار کیا کہ ’’خبردار! اہل بدعت کے ساتھ کبھی مجالست نہ کرنا اس لئے کہ یہ کفر و واضح گمراہی کا سبب ہوتے ہیں‘‘۱۱۱ اور نہ صرف یہ حکم دے کر سکوت اختیار کیا بلکہ بدعتوں سے مقابلہ کیلئے عملی چارہ کار کی نشاندہی بھی یوں فرمادی کہ تم پر واجب ہے کہ سنت نبویؐ اور سیرت ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی پیروی کرو۔‘‘۱۱۲

اس وقت دین میں کس قدر تبدیلی ہورہی تھی اور لوگ کس قدر من چاہی باتوں کو دین کی طرف منسوب کر کے اس پر عمل کررہے تھے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ اس دور کے حالات یوں بیان کرتے ہیں ’’حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد لوگوں نے سنت نبوی کو تبدیل کردیا اسمیں تحریف کردی اور دین خدا میں اس قدر من چاہی باتوں کا اضافہ کردیا کہ آج ہمارے پاس جو بھی ہے وہ سب اس کے علاوہ ہے جو وحی کی صورت میں پیامبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔‘‘۱۱۳

دین میں تحریف کی اصل وجہ

یوں تو زمان و مکان اور اس کے خاص تقاضوں اور شرائط کے مدنظر دین کے اندر تبدیلی واقع ہونے کی

بہت ساری وجوہات ممکن ہے بیان ہوں اور سبھی قدرے قدرے اسمیں دخیل بھی ہوں لیکن متون حدیث وتاریخی کتب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کی بنیادی وجہ مکتب اہل بیت علیہم السلام سے دوری تھی کہ جس کی وجہ سے مسلمانوں نے حکم خدا دریافت کرنے کے لئے یا تو ان روایتوں پر عمل کیا جو بکثرت ہونے کے باوجود سند اور دلالت کے اعتبار سے خدشہ دار تھیں۔۱۱۴

چنانچہ اس کا نتیجہ ایسے فتاویٰ اور مسائل کی شکل میں سامنے آیا کہ جس کا قرآن وسنت سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔(۱۱۵) یا پھر ان روایات کو قبول نہیں کیا جیسا کہ ابن خلدون کے بقول امام ابوحنیفہ نے جن احادیث کو قبول کیا ہے وہ صرف سترہ کی تعداد یا اسی کے لگ بھگ ہوتی ہیں اور امام مالک کے بارے میں بھی تیس حدیثوں کے ماننے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔۱۱۶

احادیث کی کثرت کے پیش نظر جب عامہ نے ان کی چھان بین کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی روایات بہت کم تھیں کہ جن پر اعتبار کیا جا سکے اور مسائل اس قدر زیادہ تھے کہ قلیل تعداد میں روایات ہونے کی بنا پر سارے مسائل کا حکم ان سے اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ اب انہیں مستقل ایسے مآخذ کی ضرورت پڑی جو ان کے روزمرہ کے مسائل کو بیان کر سکے اسی لئے انہوں نے بعض کلی قواعد بنائے اور انہیں ایک مستقل منبع کی حیثیت سے قبول کر لیا چنانچہ قیاس و استحسان جیسے قواعد بنانے کی اصل وجہ ان کے یہاں نصوص کی قلت کا ہونا ہی بیان کی جاتی ہے۔۱۱۷

جزوی طور پر یہ وجہ ایک قابل قبول چیز ہو سکتی ہے لیکن درحقیقت جیسا کہ ہم نے عرض کیا ان تمام چیزوں کی اصلی وجہ اہل بیت علیہم السلام سے دوری اور ان کے معارف سے روگردانی ہی ہے اور یہ بات خود ہمارے ائمہ علیہم السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں ''انہیں اس بات سے شرم آتی تھی کہ لوگ انہیں جاہل کہیں اور خوف آتا تھا کہ لوگ پوچھیں اور وہ جواب نہ دے سکیں تو لوگ علم کے اصلی معدن اہل بیت علیہم السلام کی طرف پلٹ جائیں لہٰذا انہوں نے رائے اور قیاس کو دین میں داخل کر دیا۔''۱۱۸

امام علیہ السلام کا موقف

جہاں روایات کی جانچ پڑتال کی بنا پر اہل سنت بقول ان کے نصوص کی قلت کا شکار تھے اور ضعیف و خدشہ دار روایات کو قبول نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انہیں مجبوراً قیاس واستحسان جیسے مستقل مآخذ بنانے پڑے (۱۱۹) وہاں امام علیہ السلام نے اس چیز کو ایک بدعت سمجھتے ہوئے یہ سیاست اپنائی کہ ایک طرف تو ایسے افراد سے جو دین میں

اپنی ذاتی رائے شامل کر رہے تھے فردی طور پر گفتگو کی اور اگر مسئلہ کا حل نہیں ہوا تو ان سے مناظرہ کر کے انہیں شکست دی اور بطلان قیاس اور حاکمیت قرآن کا عملی طور پر اعلان کر دیا (چنانچہ قیاس کی محکومیت کے سلسلہ میں کثرت کے ساتھ روایات وارد ہوئی ہیں) (۱۲۰) امام ابوحنیفہ کا آپ کے ساتھ وہ مناظرہ (۱۲۱) جس میں انہیں شکست کا منھ دیکھنا پڑا تھا اور دیگر علمی مباحثے جو اس سلسلہ میں انجام پائے (۱۲۲) تاریخی کتب میں موجود ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ جہاں آپ نے ان بدعتوں کے قلع قمع کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی اور شخصی طور پر ان کا مقابلہ کیا وہیں دوسری طرف آپ اپنے شیعوں کو بھی اس امر سے آگاہ فرماتے گئے کہ ان چیزوں سے ہوشیار رہیں۔

جس طرح آپ نے اپنے شیعوں کو بیشتر غالیوں کے ساتھ نشست و برخاست کرنے سے منع کیا تھا بالکل اسی طرح قیاس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ بھی مجالست سے دوری کا حکم فرمایا۔ (۱۲۳) اور قرآن مجید کو محور و مرکز قرار دیتے ہوئے آپ نے ہراس ماخذ اور منبع کی نفی کر دی جو قرآن سے سازگاری نہ رکھتا ہو اور قرآن کی جاودانگی کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قرآن زندہ ہے مردہ نہیں اور اسی طرح حرکت میں ہے جس طرح لیل و نہار و شمس و قمر ۱۲۴ اور یہ کتاب ہر زمانے کے لئے ہے۔ ۱۲۵ لہٰذا اس کے علاوہ تفسیر دین کے لئے وجود میں آنے والی ہر چیز غلط اور باطل ہے۔

امام علیہ السلام نے ان بدعتوں کے سامنے سخت موقف اپنا کر جہاں بدعت گزاروں کو بدعتوں کی ترویج کا خاطر خواہ موقع نہ حاصل ہونے دیا وہیں آپ نے شدت کے ساتھ اس کی علناً مخالفت کرتے ہوئے ان چیزوں کو فقہ شیعہ میں داخل ہونے سے بچالیا۔ ۱۲۶

اتحاد بین المسلمین، اور فکر اہلبیتؑ کی ترویج کے لئے آپ کی حکمت عملی :

آپ کے اصحاب کے کافی بڑے حلقہ کا مختلف اقوام و قبائل سے تعلق اور مختلف مکاتب فکر سے متعلقہ افراد کی آپکے یہاں آمد و رفت جہاں صاحبان بصیرت کے لئے اتحاد کا عملی سبق تھا وہیں آپکا یہی عمل بعض کم فہم اور ناسمجھ لوگوں میں قابل ہضم نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ آپکی تمام تر کوششوں کے بعد بھی جہالت کے گرویدہ آپ کی حمایت کا دم بھرنے والے اپنی کم مائگی کی وجہ سے آپ سے دور ہوتے چلے گئے اور یہی امر سبب بنا کہ شیعوں کے درمیان ایک مکمل فکری اتحاد نہ قائم ہو سکے چنانچہ اس زمانے میں آپ کے تمام شاگرد اور آپ کو ماننے والے تمام شیعہ اس زاویہ نظر سے نہیں دیکھ پا رہے تھے کہ جو زرارہ اور محمد بن مسلم کا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے شاگردوں میں

سے بعض اہل سنت محدثین کے دروس میں بھی حاضر ہوتے تھے جن میں بہت ساری جگھوں پر اختلاف ہونا ناگزیر تھا اس کے باوجود آپ کے شاگردوں کی طرف سے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جو آپسی رنجش یا تفرقہ کا سبب بنتی۔

اتحاد بین المسلمین کے سلسلہ میں یہ آپ ہی کی کاوشیں تھیں کہ جہاں آپکی ذات مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا محور بنی ہوئی تھیں وہیں آپکے شاگرد بھی اتحاد کا عملی مظاہرہ کرتے نظر آرہے تھے چنانچہ نہ صرف آپ کے شاگر اہلسنت محدثین کے درس میں شریک ہوتے بلکہ بعض شاگرد ایسے بھی تھے جنکے دروس میں اہلسنت کی کثیر تعداد شریک ہوتی تھی اور علمی اور فرہنگی حلقوں میں انہیں اتحاد کی علامت جانا جاتا تھا۔۱۲۷ ابان بن تغلب (متوفی ۱۴۱ھ) آپکے انہیں شاگردوں میں سے ایک ہیں جنکو علماء اہل سنت و تشیع دونوں کے درمیان محترم جانا جاتا تھا چنانچہ ابان کے سلسلہ میں ملتا ہے کہ جب وہ مدینہ آتے تھے تو بلا تفریق مذھب و مکتب لوگ انکے اردگرد جمع ہو جاتے تھے مسجد الحرام میں اس جگہ کو ابان کے لئے خالی کیا جاتا جہاں پیغمبر تکیہ کرتے تھے ۔۱۲۸

ابان کو اس دور میں شیعوں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا اسکے باوجود یہ ابان بن تغلب کی میانہ روی اور امامؑ کی تربیت کا اثر ہے کہ بزرگ علماء اھلسنت نے ابان سے وارد ہونے والی روایتوں کو اس صراحت کے ساتھ قبول کیا ہے کہ ابان اہل غلو و اہل بدعت نہیں تھے علیؑ کو شیخین سے افضل ماننے کے باوجود انہوں نے شیخین کے سلسلہ میں کوئی اہانت نہیں کی اس لئے انکی روایتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے۔۱۲۹

علمی گفتگو یا مناظروں کے علاوہ کبھی بھی امامؑ یا امام کے شاگردوں کی طرف کسی بھی اختلافی مسئلہ کا نہ چھیڑا جانا اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے لئے کوشاں رہنا اس بات کا بیان گر ہے کہ مکتب جعفری کا حقیقی پیرو کبھی بھی اختلاف و تفرقہ انگیزی کا سبب نہیں بن سکتا۔

سازگار فضا میں اتحاد کا نعرہ بلند کرنا اور ہے اور گھٹتے ہوئے ایسے ماحول میں وحدت کلمہ کی پاسداری کرنا جہاں طعن و تشنیع کے ترکش ہر پل ماحول کو مسموم بنانے پر تلے ہوں یہ حقیقی وارثان رسالت کا کمال ہے۔

وحدت کلمہ کے سلسلہ میں اس لئے بھی امامؑ کی مساعی جمیلہ بہت اہم کردار کی حامل ہیں کہ آپ ایسے وقت میں مسلمانوں کو اتحاد و یکجہتی کی دعوت دے رہے تھے جب خود آپ دو الگ الگ محاذ پر رہبری کر رہے تھے ایک طرف رحمۃ للعالمین کے نمائندہ کی حیثیت سے تمام لوگوں تک پیغام توحید پہونچانا تھا تو دوسری طرف اپنے ماننے والوں کے لئے ایسے خطوط کو ترسیم کرنا بھی ضروری تھا جن پر مکتب جعفری کی بنیاد کھڑی ہو سکے جبکہ حالات دونوں ہی کاموں کے لئے حسب منشا نہیں تھے آپکے معتقدین کی پراگندگی اور آپس کے فکری اختلافات نے آپ کی رہبری کے کام کو نہایت دشوار بنا دیا تھا ۱۳۰ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس وقت آپ کے ماننے والے تین گروہوں

میں بٹے ہوئے تھے۔

۱۔افراطی شیعہ جو کیسانی طرز تفکر رکھتے تھے۔

۲۔وہ افراد جو زید کو اپنا امام مانتے تھے اور محدثین و معتزلہ کی حمایت سے برخوردار تھے۔

۳۔آپ کے خالص شیعہ جو آپ کو منصوص من اللہ امام مانتے تھے۔[۱۳۱]

ایسی صورت حال میں سب سے بڑا کام یہ ہوسکتا تھا کہ کم از کم اپنے ماننے والوں کو ہر چیز سے زیادہ غیر اسلامی نظریات اور الحادی تفکرات کی یلغار سے بچایا جاسکے انہیں ایسے ایک مرکز پر جمع کیا جاسکے جس کے لئے آپ نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ اپنے قابل اعتبار شاگردوں کو جگہ جگہ اپنا نمایندہ مقرر کیا تاکہ وہ آپکے چاہنے والوں کو وان کے روزمرہ کے حالات سے مطلع فرماتے رہیں اور آپ انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق احکامات جاری کرتے رہیں جنہیں وہ اپنے اپنے علاقوں میں نافذ کرنے کے لئے موثر اقدامات انجام دے کر اصلی اسلامی تفکر کو رائج کرسکیں۔

چنانچہ ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ ہم اپنے مسائل کس سے دریافت کریں؟ آپ نے فرمایا ابو بصیر سے یا ایک اور جگہ فرمایا محمد بن مسلم سے اپنے مسائل کا حل معلوم کرو علاوہ ازاین آپ نے اپنے بعض معتمدین کو حکومت کی حساس جگہوں پر بغیر ظاہر کئے کہ انکا مسلک کیا ہے کام کرنے کا حکم دیا تھا جیسا کہ والی اہواز ربیع، بنی اشعث، فضل بن یحیی، خالد، فضل بن سہل، یعقوب بن داوٗد، سلیمان بن جعفر وغیرہ وہ افراد ہیں کہ جو حکم امام علیہ السلام سے حکومتی نظام کے بنیادی اراکین میں شمار ہوتے تھے۔ [۱۳۲] اور بوقت ضرورت ان کے ذریعہ سے شیعوں کی خاطر خواہ اقتصادی اور سیاسی مدد ہوتی رہتی تھی اس طرح امام علیہ السلام بغیر حکومت وقت کی نظروں میں آئے اندر اندر شیعوں کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے بقول نور الدین آل علی ’’آپ سیاسی داوٗ پیچ سے دور رہ کر اپنی واقعی رسالت کو جامہ عمل پہنا رہے تھے‘‘۔[۱۳۳]

شیعوں کی بڑھتی ہوئی پراکندہ آبادی کے پیش نظر آپ نے اپنی حسن تدبیر سے ایک کام یہ کیا کہ جب آپ نے دیکھا اب شیعہ صرف ایک خطے میں محدود نہیں ہیں بلکہ قم، کوفہ، خراسان، طبرستان، بغداد، مصر، یمن، تک پھیل چکے ہیں تو آپ نے ہر طرف اپنے وکیلوں کو بھیجنا شروع کیا تاکہ انکے امور کو نظم و ضبط کے ساتھ حل و فصل کیا جا سکے شیعوں کے مالی مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ ایک بڑا قدم تھا جسے چنانچہ امام نے ہر علاقہ میں اپنے وکیل کی تعیین کے ذریعہ سے مالی امور کی دیکھ ریکھ کے مسائل کو نظم بخش کر مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے شیعوں کے مسائل کو آسانی کے ساتھ حل کردیا ۔[۱۳۴]

فریضہ حج اور امام کی سیاست:

امام جعفر صادق علیہ السلام کے دوران امامت شیعوں کی زیادہ تر آبادی کوفہ میں تھی چنانچہ آپ سے نقل روایت کرنے والے راویوں کے اسامی کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوفہ میں آپکے چاہنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ اسی طرح خراسان، طبرستان، یمن اور قم میں بسنے والے شیعوں کے لئے طویل سفر کی مشقتوں کو دیکھتے ہوئے امام سے ملاقات کرنا ایک مشکل امر تھا اگرچہ امام نے اسکا ایک راہ حل یہ نکالا کہ خود بھی کچھ مدت تک عراق میں رہے چنانچہ امام نے ایک سے زیادہ مرتبہ عراق کا سفر کیا۔ ۱۳۵ جس سفر کا ایک اہم ثمرہ کوفہ کے لوگوں کے حالات کا قریب سے معائنہ کرنا اور انکی مشکلات سے آشنا ہونا تھا عراق کے سفر کے کافی اہم نتائج ہیں جو فی الحال ہمارے ملحوظ نظر نہیں ایسے ہی کسی ایک سفر میں جب ابان بن تغلب بھی امام کے ساتھ تھے تو امامؑ نے ابان کو حضرت علیؑ کی قبر مبارک کا نشان بتایا تھا۔ ۱۳۶

امام کی جانب سے کوفہ کا سفر ہو یا ہاشمیہ ۱۳۷ اور حیرہ کا ہر سفر کی اپنی ایک اہمیت ہے لیکن ظاہر ہے کہ امام جس جگہ کا بھی سفر کریں گے ایک ہی علاقے کے باشندوں سے ملاقات کر سکتے ہیں اس لئے امام نے ایک ایسی تدبیر اختیار کی کہ ایک ہی وقت میں الگ الگ علاقوں کے باشندوں سے ملاقات بھی ہو جائے اور یہ لوگ بھی ایک دوسرے کو جان لیں لہذا آپ نے حج کے فریضہ کو اس امر کے لئے بہتر جانا چنانچہ حج کے دوران مختلف جگہوں سے آنے والے شیعہ آپ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور اپنے مسائل کو بیان کرتے تھے چنانچہ امام رضاؑ نے حج کے فوائد میں ایک فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی باتیں حج کی برکت سے دیگر شہروں تک بھی پہونچ جاتی ہیں۔ ۱۳۸ ہشام بن حکم کہتے ہیں: میں نے منی میں امامؑ سے ۵۰۰ سوال پوچھے اور میں عرض کیا مولا وہ لوگ ایسا کہتے ہیں امامؑ نے ہر سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ تم یہ جواب دو۔ ۱۳۹

فریضہ حج میں شیعوں کے مسائل کی گفت و شنید ہو یا اپنے وکلاء کے ذریعہ انکی خبر گیری امامؑ سخت ترین حالات میں بھی اپنے چاہنے والوں سے بے خبر نہیں رہے اور اپنی الٰہی سیاست کے ذریعہ انکی رہنمائی کرتے رہے چاہے وہ کھلی ہوئی نسبی آزاد فضا ہو یا گھٹتی ہوئی فضا ہر جگہ امام نے کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر ضرور نکال لی جس سے رشد و ہدایت کے کام میں کوئی خلل نہ پڑ سکا۔

عصر منصور دوانقی میں آپ کی سیاسی حکمت عملی

یہ ٹھیک ہے کہ بنو عباس اور بنو امیہ کے مابین جنگ و جدال اور رسہ کشی کی بنا پر جو موقع امام علیہ السلام کو

فراہم ہوا وہ شیعیت کی بنیادیں مضبوط کرنے کا ایک سنہرا موقع تھا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ موقع بہت طولانی نہیں تھا اور منصور دوانقی کے زمام امور سنبھالتے ہی ایک بار پھر پوری قوم وحشت زدہ انداز میں پھونک پھونک کر ایک ایک قدم رکھنے پر مجبور تھی۔

کسی کے اوپر بھی صرف رافضی ہونے کا الزام اسے موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے کے لئے کافی تھا۔ ۱۴۰اس خطرناک صورت حال میں شیعوں کو بیہمانہ قتل سے بچانے کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ تھا تقیہ۔ چنانچہ امام علیہ السلام نے اپنے چاہنے والے کو تقیہ کا حکم دیا اور ترک تقیہ کو ترک نماز کے مساوی قرار دیتے ہوئے ۱۴۱ اسے ہر ایک شیعہ پر واجب قرار دیا اور یہ آپ کی ایسی حکمت عملی تھی کہ جس کے ذریعہ آپ نے شیعوں کو ظالم و جابر بادشاہ کے ظلم کی چکی میں پسنے سے بچالیا اور اگر امام علیہ السلام کی یہ سیاسی سوجھ بوجھ نہ ہوتی تو شیعہ بھی یا تو زیدیوں کی طرح مار دیئے جاتے یا ان کے گھر بار کو نذر آتش کر دیا جاتا یا پھر وہ زندان میں پڑے پڑے دم توڑ دیتے۔

۱۴۲حتی آپ نے اپنے خاص معتمدین سے بھی تاکید فرمائی کہ وہ تقیہ میں رہیں اور کسی پر اپنے عقیدے کو آشکار نہ کریں۔۱۴۳ امام علیہ السلام کی یہ احتیاط اس لئے تھی کہ منصور کے دور میں شیعوں پر اس قدر دباؤ تھا کہ اگر کسی کو راستے میں اپنا کوئی عزیز مل جاتا تھا تو بغیر احوال پرسی کے یوں ہی بے تفاوت گزر جاتا تھا۔۱۴۴ کہ مبادا کسی کو شک نہ ہو جائے کہ ان میں سے کوئی شیعہ ہے اور اس کی وجہ منصور کے جاسوسوں کا وہ جال تھا جو پورے شہر میں یوں پھیلا تھا کہ کس طرح کہیں کوئی اس میں پھنسے اور اسکی گردن اڑا دی جائے۔ کسی بھی شخص کے لئے صرف یہی الزام کافی تھا کہ وہ شیعہ ہے اور اسے اس جرم میں زندہ زندہ دیوار میں چن دیا جائے اور طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جائے۔۱۴۵

لیکن امام علیہ السلام نے اپنے قول و عمل سے منصور کو کوئی ایسا بہانہ نہیں دیا کہ وہ قبل از وقت آپ یا آپ کے شیعوں کے بارے میں کچھ کر سکے گرچہ اس کے دل و دماغ میں کس قدر مکروہ عزائم پرورش پا رہے تھے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا چنانچہ محمد اسقنطوری سے نقل ہے کہ میں منصور کے پاس ملاقات کی غرض سے گیا تو اسے بہت گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا میں نے کہا کس سوچ میں گم ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ اولاد زہرا سلام اللہ علیہا میں سے بیس ہزار (۲۰۰۰۰) لوگوں کو قتل کر چکا ہوں لیکن ان کی سب سے بڑی شخصیت امام صادق علیہ السلام کو قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں یہی سوچ رہا ہوں کہ کس طرح.....۱۴۶

منصور کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کس قدر ناپاک عزائم چھپے ہوئے تھے لیکن اسے انہیں عملی کرنے کے لئے کوئی بہانہ میسر نہیں ہو پا رہا تھا اور امام علیہ السلام کی یہ ایک خاص سیاسی حکمت عملی تھی کہ

جس میں آپ دشمن کے ہاتھ کوئی بہانہ دئے بغیر مستقبل تشیع تعمیر کر رہے تھے۔

ایک سوال

امام علیہ السلام کی زندگی اور وہ بھی آپ کی سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھی جائے اور یہ سوال پیدا نہ ہو کہ امام علیہ السلام نے قیام کیوں نہیں کیا؟ ناممکن ہے ۔

امام علیہ السلام نے قیام کیوں نہیں کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے کافی تشریح طلب ہے لیکن ہم اختصار کے پیش نظر آپ کے قیام نہ کرنے کی صرف ایک وہ علت بیان کر رہے ہیں کہ جس میں آپ نے ابوسلمہ خلال کی دعوت قیام کے جواب میں فرمایا ''نہ تم میرا بھلا چاہنے والے ہو اور نہ ہی زمانہ میرا زمانہ ہے'' (۱۴۷) امام علیہ السلام کے اس مختصر جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں قیام نہ کرنے کی سب سے بنیادی وجہ اعوان و انصار کا نہ ہونا تھی۔ اس کے علاوہ امام علیہ السلام کی نظروں میں حالات قیام کے لئے مہیہ نہ تھے۔ لہٰذا آپ نے ایک ایسی مدبرانہ حکمت عملی اختیار کی کہ جس کے ذریعہ آپ اطمینان کے ساتھ شیعوں کو ثقافتی، فرہنگی، اور تربیتی میدانوں میں آگے بڑھائیں اور سلاطین زمانہ بھی کچھ نہ کرسکیں اور آپکی ہی وہ سیاست تھی کہ جس نے آج تک مکتب تشیع کو زندہ جاوید رکھا ہوا ہے، اور فرہنگ اور تہذیب کے اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے موجود غنی اور بے نیاز ترین مکاتب فکر میں ہوتا ہے اور یہ سب نہیں ہے مگر امام صادق علیہ السلام کی اس سیاست کا نتیجہ جو آپ نے اپنے زمانے کے خاص شرائط کو دیکھتے ہوئے اختیار کی تھی۔

حوالے وحواشی:

(۱) رهیافتی بر علم سیاست وجنبش های اسلامی معاصر، ص/۱۹۔ فلسفہ سیاست ص/۱۷

(۲) فی الیہ امر الدین والدنیا لیسوس عباده، اصول کافی محمد بن یعقوب کلینی ج/۱، کتاب الحجہ'' والامام ...مضطلع بالامامة، عالم بالسیاسة، اصول کافی ج/۱، ص/۲۲'' ساسة العباد، زیارت جامعہ'''' آخرة الزعامة حفظ السیاسة'' غرر الحکم جلد/۳، ص/۳۸۴، کان بنو اسرائیل یسوسهم انبیائهم : ای تتولی امورهم کما یفعل الامراء والولاة با لرعیه (مجمع البحرین، جلد ۴ مادہ سوس، لسان العرب جلد ۶/ص ۴۲۹) انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوم کے لوگوں کے لئے تدبیر امور کرتے تھے یعنی ان پر نظارت رکھتے تھے جس طرح بادشاہ اور حکمراں اپنی رعایا پر نظارت رکھتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام: نحن اخیار الدهر و نوامیس العصر و نحن ساسة العباد و ساسة البلاد، (بحار الانوار، ۹۱، ۳۴۲)

(۳) ساس، ساسة القوم، دبر هم وتولیٰ امرهم، المنجد، ج/۱، ص/۳۶۲

(۴) القیام علی الشئ بما یصلحه، تاج العروس مادہ ساس

(۵) ساس، سیاسة الوالی، الرعیة، فرهنگ لاروس احمد طبیان، ج/۲

(۶) (لغت نامہ دهخدا، مادہ سیاست)

(۷) سیاست: سوس سے ماخوذ ہے اور ریاست، پرورش، تنبیہ وسزا، رعایا کے امور کو منظم اور منسجم کرنے کے معنی میں آتا ہے (ابن منظور، لسان العرب، جلد۶ ص۴۲۹)

(۸) (اردو دائرۃ المعارف جلد۱۱ص ۴۸۳)

(۹) Politics is the actions or activities which people use to achieve power in a country society ao orgnization, (B.B. C. Einglish dictinary)

(۱۰) **استصلاح الخلق بارشادھم الیٰ الطریق المنجی**، المنجد، ج۱/ص۳۶۲

(۱۱) **استصلاح الخلق بارشادھم بما یصلحم، فرھنگ لاروس ترجمہ طبیان**، ج۲،

(۱۲) **لسیاسۃ استصلاح الخلق بارشادھم الی الطریق المنجی فی العاجل و الاجل** ، دنیاوآخرت میں لوگوں کی نجات کے راستہ کی طرف ہدایت کرنا سعید الخوری شرتونی: اقرب الموارد فی فصح العربیہ والشوادر، جلد۱

(۱۳) **السیاسۃ ھی ان تودی حق اللہ و حق الاحیا و الاموات** سیرۃ الائمہ اثناعشر ، جلد۱ص ۵۲۵

(۱۴) **کان بنو اسرائیل یسوسھم انبیائھم : ای تتولی امورھم کما یفعل الامراء و الولاۃ با لرعیہ** (مجمع البحرین، جلد۴ مادہ سوس، لسان العرب جلد۶/ص۴۲۹) انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوم کے لوگوں کے لئے تدبیر امور کرتے تھے یعنی ان پر نظارت رکھتے تھے جس طرح بادشاہ اور حکمراں اپنی رعایا پر نظارت رکھتے ہیں۔

(۱۵) (حکمت اصول سیاسی اسلام، ص۴۱)

(۱۶) محمد تقی مصباح، نظریہ سیاسی اسلام، ۴۲)

(۱۷) سیاسیات، نظریات اور اصول، ڈاکٹر محمد اعظم چودھری، ص۲۲

(۱۸) ایضاً۔ص، ۲۰

(۱۹) ایضاً۔ص، ۲۱)

(۲۰) ایضاً ص۲۱)

(۲۱) ڈاکٹر علی شریعتی: تاریخ ادیان، ص۱۱

(۲۲) (نوروزی، جواد، نظام سیاسی اسلام، ص، ۱۶

(۲۳)۔عبدالرحمٰن عالم، بنیادہائی علم سیاست، ص۲۹

(۲۴) سیاسیات، نظریات اور اصول، ڈاکٹر محمد اعظم چودھری، ص۲۱

(۲۵) سیاسیات، نظریات اور اصول، ڈاکٹر محمد اعظم چودھری، ص۲۱

(۲۶) رہیافتی بر علم سیاست، نقل از صحیفہ نور، ج۱۳/

(۲۷) مروج الذہب ج۳/ص۲۹۷/

(۲۸) ابن شہرآشوب، مناقب آل ابی طالب، جلد۴ ص۲۸۰، ڈاکٹر منتظر القائم، تاریخ امامت، ص۱۹۴

(۲۹) سیرہ پیشوایان ص۳۴۹/

(۳۰) سیرہ پیشوایان ص۱۱/، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ڈاکٹر منتظر القائم، تاریخ امامت، ص، ۱۷۶

(۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، سیرہ پیشوایان، ص۳۴۹/ تا ۳۵۲

(۳۶) تشیع در مسیر تاریخ، ص/۳۰۳
(۳۷) ڈاکٹر اصغر منتظر القائم ،تاریخ امامت ،ص ۱۷۶
(۳۸)، الامام الصادق علیہ السلام ،قدوۃ واسوہ، علامہ محمد تقی مدرسی۔
(۳۹) شہید مطہری، سیری در سیرہ ائمہ اطہار علیہم السلام، ص ۱۳۸ تا ۱۶۶،
(۴۰) ان اصحاب الحدیث قد جمعوا الرواۃ عن الصادق علیہ السلام من الثقات علی اختلافھم فی الادلۃ والمقامات فکانوا اربعۃ آلاف، شیخ مفید، الارشاد، ص/۲۷۱
(۴۱) (محمد تقی مدرسی، الامام الصادق، قدوہ واسوہ، ص ۱۸۔
(۴۲) سیرۂ پیشوایان، ص/۳۵۶
(۴۳) الامام الصادق کما عرفہ علماء الغرب
(۴۴) (الکامل فی ضعفاء الرجال جلد ۲، ۱۳۲) الارشاد ص ۱۹۰)
(۴۵) سیرۂ پیشوایان، ص/۳۵۹، روضات الجنات، ج/۸، ۱۶۹
(۴۶) ان علم الناس اھلھم باختلاف الناس، الامام ابوحنیفہ، ص/۷۰، الامام الصادق، ص/۲۸، ولقد کثر الماثور فتاوی الصحابہ فی ذالک العصر کثرۃ عظیمہ شغلت عقول الفقھاء... الامام ابو حنیفہ
(۴۷) لولاالسنتان لھلک نعمان ، علامہ محمد تقی مدرسی، الامام الصادق، اسوہ وقدوہ ص/۱۸ سیرۂ پیشوایان نقل از الامام الصادق علیہ السلام، والمذاہب الاربعۃ، ج/۲، ص/۱۱۳،
(۴۸) کان جعفر لا یخلو من احدی ثلاث خصال اما یصل و ما صائم و امایقرء القرآن، تھذیب التھذیب، علامہ محمد تقی مدرسی، الامام الصادق قدوہ واسوہ ص/۱۸)
(۴۹) جعفر بن محمد الذی ملاء الدنیا علمہ وفقہ ویقال ان اباحنیفہ من تلازمۃ وکذٰلک... رسائل الجاحظ، ص/۱۰۶
(۵۰) وھو ذو العلم غزیر فی الدین وادب کامل فی الحکمۃ وزھد بالغ فی الدنیا، الملل والنحل، شہرستانی، ج/۱، ص/۱۴۷
(۵۱) وکان من سادات ولقب بالصادق لصدق مقالتہ وفضلہ اشھر من ان یذکر وفیات الاعیان ،ج/۸، ص/۱۰۵
(۵۲) الامام الصادق کما عرفہ: العلماء الغرب، ڈاکٹر نورالدین آملی، ص/۷
۵۳) انتم تقولون فیھا کذا و اھل المدینۃ یقولون کذا و نحن نقول کذا فربما تابعنا و ربما تابع اھل المدینہ و ربما خالفنا جمیعا' (تھذیب الکمال، جلد ۵، ۷۹)
(۵۴) مارایت احدا افقہ من جعفر بن محمد ایضاً
(۵۵) الدکتور محمد یحیی الھاشمی ، الامام الصادق علیہ السلام ، ملھم الکیمیاء ،
(۵۶ و ۵۷) کان اول ناقد التاریخ واول من وضع ھذا الاسم ،ایضا ص/۴۹ تا ۲۴۶، قدوہ واسوہ علامہ محمد تقی مدرسی، ص ۱۹، سید محمد کاظم القزوینی، موسوعۃ الامام الصادق علیہ السلام، ص ۱۸۰)
(۵۸) موسوعۃ الامام الصادق علیہ السلام
(۵۹) الامام الصادق کما عرفہ: العلماء الغرب، ڈاکٹر نورالدین آملی، ص/۷
(۶۰) سیرۂ پیشوایان، ص/۳۶۶، مسلمانان در بستر تاریخ، یعقوب جعفری، ص/۲۴۶

(٦١)تحول مبانی مشروعیت خلافت از آغاز تافروپاشی عباسیان،ص/٢٠١۔ڈاکٹر حاتم قادری

(٦٢)الایضاح،ص/١٧

٦٣)اختیار معرفۃ الرجال،جلد١،ص٤٢٤

(٦٤)ایضا،جلد٢،٤٢٥

(٦٥)تحول مبانی مشروعیت خلافت از آغاز تافروپاشی عباسیان،ص/٢٠١۔ڈاکٹر حاتم قادری

(٦٦)ایضاً،مسلمانان در بستر تاریخ،یعقوب جعفری،ص/٢٤٦،

(٦٧)**لم یرو عن جعفر محمد حتی ظهر امر بنی عباس** (مالک ابن انس کے بارے میں) سیر اعلام النبلاء،ج/٦،٢٥٦،الکامل فی ضعفاء الرجال،ج/٢،ص/٥٥٥

(٦٨)مسلمانان در بستر تاریخ یعقوب جعفری،ص/٢٤٦

(٦٩)**تاریخ الخلفاء، سیوطی**،ص/٢٦١،فرق ومذاہب اسلامی،ص/٤٦

(٧٠)نشر احادیث کے سلسلہ میں آپکی جدو جہد کے لئے ملاحظہ ہو..شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ،ج/١،ص/١٨، تاریخ التشریع الاسلامی،ص/٢٦٣،دلیل القضاء الشرعی ج/٣،ص/١٦٠المناقب،ج/٤،٢٤٢،جابر بن عبداللہ انصاری نے اجازہ نقل کے لئے بصرہ کا سفر کیا اور عبد اللہ ابن ابنین سے اجازہ حاصل کیا۔علوم الحدیث ومصطلحہ،ص/٤٥

(٧١)**بحرانی، لؤلؤۃ البحرین**،ص/٣،

(٧٢)ایضا،و **الاجازات العلمیه**،ص/٢١

(٧٣)اختیار معرفۃ الرجال،جلد١،ص٣٤٧)

(٧٤)اختیار معرفۃ الرجال،جلد١،ص٤٠٠

(٧٥)ایضا

(٧٦)**"احفظوا بکتبکم فانکم سوف تحتاجون الیها، الکافی، ج/٨، الامام الصادق کما عرفه الغرب**،ص/٦٢،"**ایتها العصابة! علیکم بآثار رسول الله وسننه وآثار الائمة الهداة من اهل بیت رسول الله**،وسائل الشیعہ ،ج/١٨،ص/٢٣، **احفظوا بکتبکم فانکم سوف تحتاجون الیها(الکافی**،ج/٨،)

(٧٧)منکرات ربوبیت کی رد میں،الذریعہ،ج/٢،ص/٤٨٤

(٧٨)**اثبات وحدانیت خدا**،بحار الانوار،ج/٣،ص/٥٨

(٧٩)**تجارت صنعت و** ..تحف العقول ص/٣٣١

(٨٠)فقہ کی ابواب بندی سے متعلق۔الذریعہ،ج/٢،ص/١٠١

(٨١)غنائم کے سلسلہ میں تحف العقول ص/٣٣٩

(٨٢)الذریعہ ج/٢،ص/٤٨٥،کشف الریبہ،ص/١٢٢

(٨٤)رجال النجاشی ص/١٤او **تدوین السنة الشریفه** ص/١٦٧،لمدخل الفقہی العام ج/١،ص/٤٧

(٨٥)رجال النجاشی ص/١٤او **تدوین السنة الشریفه** ص/١٦٧،فہرست شیخ طوسی ص/١٧٥،فلاسفۃ الشیعہ ص/٥٠٧

(٨٦)رجال النجاشی ص/١٤او **تدوین السنة الشریفه** ص/١٦٧،سیر حدیث در اسلام ص/١٠٩

(۸۷)ڈاکٹر منتظر القائم،تاریخ امامت،ص ۱۹۱،)،سیر حدیث در اسلام ص/۱۰۹

(۸۸)فہرست شیخ طوسی ص/۵/۱۷۵،فلاسفۃ الشیعہ ص/۵۰۷،المدخل الفقہی العام ج/۱،ص/۴۷،المدخل الفقہی العام ج/۱،ص/۴۷، **احفظوا بکتبکم فانکم سوف تحتاجون الیھا، الکافی**،ج/۸،الامام ابوحنیفہ)مقدمہ ابن خلدون ص/۴۳۴

(۸۹)،و۹۰ابوالجارود کے پیرو کہ جس نے امام علی علیہ السلام سے روایات بھی نقل کی ہیں،شیعہ در تاریخ/۴ ایضا،شیعہ در تاریخ ص/۸۴،سیری در سیرہ ائمہ اطہار علیہم السلام ص/۱۲۸،شہید مطہری،شیعہ در تاریخ ص/۸۴،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳،ملل والنحل شہرستانی

(۹۱)شیعہ در تاریخ ص/۸۴،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳،ملل والنحل شہرستانی،ایضا،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳

(۹۲)ایضا،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳

(۹۳)ملل والنحل شہرستانی ج/۱،ص/۹۰،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳

(۹۴)ایضاً،شیعہ در تاریخ ص/۸۱،**فرق ومذاهب اسلامی**

۹۵)شیعہ در تاریخ ص/۸۱،**فرق ومذاهب اسلامی**

(۹۶،۹۷،۹۸،۹۹،۱۰۰)ایضا،تاریخ شیعہ وفرقہ ہائے اسلام تا قرن چہارم ص/۶۳،ملل والنحل شہرستانی

(۱۰۱)وہی مدرک،غالیان کاوشی در جریانہا و برآیندہا،ص/۱۰۴.۱۰۲)ایضا..ومستدرک الوسائل ج/۱۲اص/۳۱،خطط مقریزی ج/۴ص/۱۷۴،امالی شیخ طوسی ج/۲،ص/۲۶۴،علل الشرائع ج/اص/۲۲۷،**واللہ لو اقررت بما یقول فیّ اھل الکوفہ لاخذتنی الارض وما انا الا عبد مملوک لا اقدر علی شئی ضر ولا نفع**''اختیار معرفۃ الرجال جلد۲،ص۵۹۰)

خطط مقریزی ج/۴ص/۱۲۷،منہج المقال ص/۲۷،تاریخ طبری ج/۹ص/۱۷۳،علل الشرائع ج/اص/۲۷

(۱۰۲)...**توبوا الیٰ اللہ فانکم فساق کفار مشرکون**﴾خطط مقریزی ج/۴ص/۱۲۷،منہج المقال ص/۲۷،تاریخ طبری ج/۹ص/۱۷۳،علل الشرائع ج/اص/۲۷

(۱۰۳)ا**مفضل لا تقاعدوھم ولا توأکلوھم ولا تشاربوھم و تصالحوھم، رجال کش حدیث**/۲۵ومستدرک الوسائل ج/۱۲اص/۳۱،خطط مقریزی ج/۴ص/۱۷۴،امالی شیخ طوسی ج/۲،ص/۲۶۴،علل الشرائع ج/اص/۲۲۷،خطط مقریزی ج/۴ص/۱۲۷،منہج المقال ص/۲۷،تاریخ طبری ج/۹ص/۱۷۳،علل الشرائع ج/اص/۱۲۷،**لا تقاعدوھم ولا توأکلوھم، غالیان کاوشی درجریانھا وبر آیندھا** ص/۱۶۶،ملل ونحل شہرستانی ج/اص/۸۶

(۱۰۴)**الغلاۃ شر خلق اللہ یصغرون عظمۃ اللہ ویدعون الربوبیۃ لعباد اللہ**'' امالی شیخ طوسیؒ ج/۲ص/۲۶۴

(۱۰۵))**ابو الخطاب محمد ابن ابی زینب ... ملعون واصحابہ ملعونون فلا تجالس اھل مقالھم**، ص/۱۴۲،**فانی منھم بری وآبائی منھم براء**،الغیبۃص/۱۷۷،**الامام الصادق کما عرفہ العلماء الغرب**،مالی شیخ طوسیؒ ج/۲ص/۲۶۴

(۱۰۶و۱۰۷)'' **ولا تقبلوا علینا حدیثاً الا ما وافق القرآن والسنۃ او تجدون معہ شاھد من احادیثنا المقدمۃفان المغیرۃ بن سعید لعنۃ اللہ دس فی کتب ابی احادیث لم یحدث بھا ابی فاتقوا اللہ وتقبلوا علینا ما خالف قول ربنا تعالیٰ وسنۃ نبینا**'' **مناقب الامام امیر المومنین علیہ السلام**،ج/۲،ص/۲۸۶،مالی شیخ طوسیؒ ج/۲ص/۲۶۴،مقریزی ج/۴ص/۱۷۴،امالی شیخ طوسی ج/۲،ص/۲۶۴،علل الشرائع ج/اص/۲۲۷،خطط مقریزی ج/۴ص/۱۲۷،منہج المقال ص/۲۷،تا،علل الشرائع ج/اص/۱۲۷

فکلما کان فی کتب اصحاب ابی من الغلو فذاک مادسہ مغیرۃ بن سعید فی کتبھم'' وہی مدرک ص/۲۲۵۔

۱۰۸)رسول جعفریان،حیات فکری وسیای امامان علیہم السلام نقل از العقیدۃ الشریفۃ فی الاسلام،ص/۲۰۹

(۱۰۹)تحریف القرآن بین الشیعة و السنة ص/۶۶،العقیدۃ الشریفۃ فی الاسلام،ص/۲۰۹

(۱۱۰)الامام ابوحنیفہ ص/۱۱۱

(۱۱۱)” واحذر مجالسة اهل البدع فانها تنبت فی القلب کفراً وضلالاً مبینا“مصباح الشریفۃ،ص/۳۸۹

۱۱۲)وسائل الشیعہ ج/۱۸،ص/۲۳

(۱۱۳)” ان النـاس بعد بنی امیة رکب به سنة من کان قبلکم فغیروا وبدلو احرفوا وزادو فی دین الله ونقصوا منه فما من شئ علیه الناس الیوم الا وهو منحرف عما نزل به الوحی من عند الله“الامام ابوحنیفہ،ص/۱۱۱

(۱۱۴)تفسیر طبری ج/۱۱ص/۵۷،تفسیر ابن کثیر،ج/۷ص/۱۷۱،صحیح مسلم،بـاب اثبـات الرویة المومن فی الآخرة ربهم سبحانه،سنن ابن ماجہ ج/۱ص/۶۷،مسند احمد بن حنبل ج/۶ ص/۳۳۲،الاسماء والصفات،بیہقی ص/۳۰۷،توحید ابن خزیمہ ص/۲۲۱،سنن ابن داؤد کتاب السنۃ، سنن ترمذی کتاب الجنة باب ماجاء فی رؤیة الرب تبارک وتعالیٰ،ج/۱۰،ص/۱۹،تفسیر خازن،ج/۴،ص/۲۹۸

(۱۱۵) واتـخـذوها خبر فی اجتهادهم فتاثروابها فی اجتهادهم، الامام ابو حنیفه ص/۱۰۵،المدخل الفقہی العام،ج/۱،ص/۴۷مسند احمد بن حنبل ج/۶،ص/۳۳۲توحید ابن خزیمہ ص/۲۲۱تفسیر خازن ج/۴،ص/۲۹۸

(۱۱۶)مقدمہ خلدون ص/۴۳۴

(۱۱۷)المدخل الفقہی العام ج/۱،ص/۴۷

(۱۱۸)”ویستـحیـون ان یـنسبهـم الـنـاس الیٰ الـجهـل ویـکـرهون ان یسألوا فلا یجیبون فیطلب الناس العلم من معدنه فلذالک استعملوا الرائ والقیاس فی دین الله وترکوا الآثار ودانو بالبدع“وسائل الشیعہ ج/۱۸،ص/۴۰

(۱۱۹)حیات فکری وسیاسی امامان علیہم السلام رسول جعفریان ص/۳۵۳

(۱۲۰)وسائل الشیعہ ج/۱۸،ص/۲۹،الکافی ج/۱،ص/۵۸،علل الشرائع ج/۱،ص/۸۳،رجال کشی ص/۱۸۹،الموفقیات ص/۶۷

(۱۲۱)ایضاً،الموفقیات ص/۶۷

(۱۱۲۲)الاحتجاج ص/۱۹۶،الموفقیات ص

(۱۱۲۳)مصباح الشریعہ ص/۳۸۹،المحاسن ص/۲۰۵،تشیع درمسیر تاریخ ص/۳۱۲

(۱۲۴)ان القرآن حی لم یمت وانه یجری کما یجری اللیل والنهار وکما یجری الشمس والقمر،تفسیر عیاشی،ج/۱،ص/۹

(۱۲۵)ان القرآن فی کل زمان جدید“ عیون اخبار الرضاء ج/۲،ص/۸۷،بحار الانوار ج/۲،ص/۲۸

(۱۲۶)ایضاً،حیات فکری وسیاسی امامان رسول جعفریان ص/۳۵۳

(۱۲۷)میراث مکتوب شیعہ از سہ قرن نخستین ھجری ص ۸۷

(۱۲۸)رجال النجاشی،ص ۱۱

(۱۲۹)میزان الاعتدال،جلد۱،ص ۵

(۱۳۰)حیات فکری وسیاسی امامان رسول جعفریان ص/۳۵۳،امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص/۱۲۱،شیعہ درمسیر تاریخ ص/۸۳

(۱۳۱)ایضاً

(۱۳۲)ایضا،ص/۳۳۳،)الامام الصادق کما عرفه علماء الغرب ص،/۳۵۶

(۱۳۳)، حیاۃ الامام الباقرج ۱ص ۳۵۶، امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص ۲۱۔
(۱۳۴) تہذیب المقال، جلد ا ص ۱۳۲)
(۱۳۵) الکافی، جلد ۶، ۴۴۵
(۱۳۶) کامل الزیارات، ص ۸۳، الکافی، جلد ۴ ص ۵۷۲
(۱۳۷) معجم البلدان، ج ۵، ۳۸۹ ہاشمیہ کوفہ کے نزدیک سفاح کے ذریعہ تعمیر کیا گیا شہر
(۱۳۸) عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۱ ص ۱۲۶
(۱۳۹) الکافی، جلد ۱ ص ۲۶
(۱۴۰) لشیعہ والحاکمون، محمد جواد مغنیہ ص ۱۴۹، امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص ۱۲۱، تشیع درمسیر تاریخ ص ۳۱۲
(۱۴۱) ایضاً
(۱۴۲) مامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص ۱۲۱
(۱۲۱) حیاۃ الامام الباقرج ۱ص ۳۵۶، امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص ۱۲۱
(۱۴۳) حیاۃ الامام الباقرج ۱ص ۳۵۶، یا معلی کتمتم امرنا ولا نذعه فان من کتم امرنا و لا تذیعه ... مختصر بصائر الدرجات ص ۳۲
(۱۴۴) ایضاً الشیعہ والحاکمون،،، محمد جواد مغنیہ ص ۴۹، امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص
(۱۴۵) کان له بالمد ینه جواسیس ینظرون علی من اتفق شیعه جعفر فتضربون عنقه " ابن اثیر ج ۴ ص ۷۵، وسائل الشیعہ ج ۱۹ ص ۲۸۲، المنتخب من ذیل المزیل ص ۶۵۲، تاریخ مسعودی ج ۳ ص
(۱۴۶) لشیعہ والحاکمون، محمد جواد مغنیہ ص ۱۴۹، حیات فکری وسیاسی امامان رسول جعفریان ص ۳۵۳، امامان شیعہ وجنبشہای مکتبی ص ۱۲۱، شیعہ در مسیر تاریخ ص
(۱۴۷) ''ما انت من رجالی ولا الزمان زمانی'' حیاۃ الامام الرضا ص ۴۹

حج مرکز اتحاد و بندگی

سید احتشام عباس زیدی

مقدمہ:

اسلام کا عبادی نظام اپنے دامن میں انسان کی خدا کی بارگاہ میں عبودیت کا جو بہترین مرقع رکھتا ہے اس کی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی ۔ خداوند عالم نے انسانوں کو اپنی بندگی کے ذریعہ ہی خود شناس اور خدا شناس بنایا ہے اور عبادت کے ذریعہ ہی اس کے قدموں میں اس کے ارتقاع و کمال کی راہیں کھولی ہیں۔

حج، اسلام کی وہ جامع اور کامل عبادت ہے جس میں مکمل اسلام کے جلوہ پورے طور سے نمایاں ہیں۔ رزق حلال کے حصول کے ذریعہ معاشی زندگی کی ترقی اور آسودگی اور پھر رزاق کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے دنیاوی لذتوں کا لباس اتار کر، الٰہی لباس زیب تن کرتے ہوئے اس کے گھر کی جانب سفر کرنا، خانہ حق کا طواف کرنا اور اس کی بارگاہ میں ایثار و قربانی کی منزل سے گزر کر دنیا کے فریب سے آزاد ہونا اور خدا سے قریب ہونا حج کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔ پوری دنیا سے کھینچ کر ایک نقطہ پر جمع ہونا اور

ایک گھر کی جانب سجدہ ریز ہونا، امت مسلمہ کے عظیم اتحاد کا منظر پیش کرتا ہے اور جب جسم ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو دل اور روحیں بھی باہم قریب ہوتی ہیں۔ یہ نمونہ ایک طرف انسان کی عظمت کو اجاگر کرتا ہے تو دوسری طرف اسلام کی انسان ساز عبادت کو جلوہ گر کرتا ہے۔

کعبہ، دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے جس کی بنا جناب آدمؑ نے ڈالی اور جس کی پرشکوہ تعمیر جناب ابراہیمؑ اور جناب اسماعیلؑ کے ہاتھوں انجام پائی اور جناب ابراہیمؑ کو خدا کی جانب سے حکم ہوا کہ لوگوں کو حج کے لئے بلاؤ، چنانچہ گزشتہ انبیاء و مرسلین نے خدا کے اس گھر کا طواف کرنے اور حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے عہد میں متعدد سفر کئے اور اس عبادت کی عظمت کا احساس کرایا۔

متعدد احادیث میں جہاں حج کی عظمت بیان کی گئی ہے اور حج کو اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن بتایا گیا ہے وہیں، تارک حج کے لئے اسطرح کی روایتیں بھی آئیں ہیں کہ وہ مسلمان نہیں مرتا بلکہ کافر، یہودی یا عیسائی کی موت مرتا ہے۔

ذیل میں آیات و روایات کی روشنی میں حج کا فلسفہ، حج اور انبیاء، اور تارک حج کی عقوبت بیان کی گئی ہے۔

حج کا فلسفہ

قرآن مجید:

''اللہ نے کعبہ کو جو بیت الحرام ہے لوگوں کے لئے قیام و صلاح کا ذریعہ قرار دیا''۔[۱]

''مقصد یہ ہے کے اپنے منافع کا مشاہدہ کریں اور چند معین دنوں میں چوپایوں پر جو خدا نے بطور رزق عطا کئے ہیں اس کا نام لیں اور تم اس میں سے کھاؤ اور بھوکے محتاج افراد کو بھی کھاؤ''۔[۲]

احادیث شریفہ:

- رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: طواف خانہ کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی اور رمی جمرات کو صرف خدا

کی یاد میں قائم کرنے کے لئے قرار دیا گیا ہے۔[۳۳]

امام علی علیہ السلام: اور تمہارے اوپر (اللہ نے) اپنے اس بیت الحرام (کعبہ) کے حج کو واجب قرار دیا ہے جس کو تمام لوگوں کا قبلہ بنایا ہے اس کے پاس لوگ (یہاں سے) جانوروں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور کبوتروں کی طرح والہانہ (عقیدت رکھتے ہوئے) آتے ہیں۔ اس کو اللہ نے اپنی عظمت کے سامنے لوگوں کی فروتنی کی نشانی قرار دیا ہے اور اپنی عزت وکرامت کی نسبت ان کے یقین کی علامت بنایا ہے اور اپنی مخلوق میں سے کچھ ایسے سننے والوں فرمانبردار بندوں کو منتخب کرلیا ہے جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں، اس کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں جو اس کے عرش کا طواف کرنے میں مشغول ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو عبادت الٰہی کی تجارت گاہ میں بہت بڑا نفع اٹھاتے ہیں اور اللہ کے نزدیک اس کی مغفرت کی وعدہ گاہ (خانہ کعبہ) کی طرف بڑی تیزی سے آتے ہیں جسے اللہ نے اسلام کا پرچم اور پناہ لینے والوں کے لئے حرام قرار دیا ہے۔[۳۴]

- عیسی بن یونس: ابن ابی العوجاء، حسن بصری کے شاگردوں میں سے تھا پھر راہ توحید سے منحرف ہوگیا .. .. وہ حضرت امام جعفر صادق (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا ....اور بولا: کب تک اس کو کھلیان کی طرح پیروں سے روندتے رہوگے اور کب تک اس پتھر (حجر اسود) کی پناہ لیتے رہوگے اور اینٹ اور ٹھیکروں کے بنے اس گھر (کعبہ) کی عبادت کرتے رہوگے اور فراری اونٹ کی طرح اس کے ارد گرد دوڑتے رہوگے؟ جو شخص اس بارے میں غور وفکر کرے وہ اچھی طرح جان لے گا اس عمل کا مؤسس کوئی ناعاقبت اندیش اور کج فکر تھا، تم ہی بتاؤ کہ (یہ سب کیا ہے؟) تم تو آئین کے سرغنہ اور بڑے ٹھیکیدار ہو اور تمہارا باپ اسی نظام وقانون کا بانی تھا۔

- امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: خداوند متعال جسے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کے دل کو اندھا بنا دیتا ہے اس کے لئے حق کو ناپسندیدہ بنا دیتا ہے اور حق اسے کسی طرح نہیں بھا سکتا اور شیطان اس کا سرپرست، پروردگار اور ہمنشین بن جاتا ہے جو اسے ہلاکت کے گڑھوں میں ڈال دیتا ہے اور پھر اسے نہیں نکالتا (سن) یہ اللہ کا وہ گھر ہے جس کے ذریعہ اللہ نے اپنی مخلوقات کو اپنی عبادت کی طرف دعوت دی ہے تاکہ عبادت بجالانے میں ان کی اطاعت وفرمانبرداری کا امتحان لے، لہذا اس نے انہیں اس گھر کی تعظیم وتکریم اور زیارت کی ترغیب دلائی ہے اور اسے اپنے انبیاء کرام کا محل اور نماز گزاروں کا قبلہ قرار دیا ہے یہ (صرف در ودیوار اور پتھر نہیں بلکہ) خوشنودی خدا کا ایک

حصہ ہے اوراس کی مغفرت پانے کا راستہ ہے، یہ (گھر) کمال کی بلندی پر قائم اور عظمت وجلال الٰہی کا مرکز ہے۔۵

● ابان بن عثمان: اپنے خبر دینے والے شخص (ایک واسطہ) سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام سے عرض کیا: حج کو حج کیوں کہا جاتا ہے؟ فرمایا: فلاں نے حج کیا یعنی فلاں کامیاب ہوگیا۔۶

● امام محمد باقر علیہ السلام نے اللہ تعالی کے ارشاد: ''تاکہ وہ اپنے لئے منفعتوں کا مشاہدہ خود کرلیں'' کے بارے میں فرمایا ہے یعنی عفو وبخشش (الٰہی مغفرت حاصل کرلیں)۔۷

● سلمہ بن محرز کہتے ہیں: کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں موجود تھا کہ اتنے میں آپ کی خدمت میں ایک شخص آیا جس کا نام ''ابوالورد'' تھا اس نے امام سے کہا: خدا آپ پر رحمت نازل کرے کاش کہ آپ اپنے جسم کو محمل سفر کی تکلیف سے نجات دیتے اور آرام کرتے۔ امامؑ نے فرمایا: اے ابولورد! میں ان منافع کا مشاہدہ کرنا پسند کرتا ہوں جن کا تذکرہ اللہ نے ﴿لیشھد وا منافع لھم﴾ میں فرمایا ہے بے شک کوئی شخص حج میں حاضر نہیں ہوگا مگر یہ کہ اسے اللہ منفعت دے گا (یعنی جو بھی مکہ حج کرنے آئے گا فائدہ اٹھائے گا) تم لوگ بخشے ہوئے پلٹتے ہو لیکن تمہارے علاوہ دوسرے لوگوں کے مال ودولت اور اہل وعیال محفوظ رہتے ہیں۔۸

● ربیع بن خثیم: میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ کو محمل میں بٹھا کر کعبہ کا طواف کرایا جارہا تھا کیونکہ آپ شدید مریض تھے جب بھی (طواف کے دوران) رکن یمانی کے پاس پہنچتے تو حکم دیتے کہ انہیں زمین پر اتار دیں پھر دست مبارک کو محمل کے دریچہ سے باہر نکال کر زمین پر پھیراتے تھے اور فرماتے تھے: مجھے اٹھالو! جب آپ نے ایسا کیا اور ہر جگہ زمین پر ہاتھ پھیرا تو میں نے عرض کیا: فرزند رسول خدا! آپ پر میں قربان! یہ آپ کے لئے بڑا سخت ہے فرمایا: میں نے اللہ کا ارشاد سن رکھا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے: ''تاکہ وہ اپنے منافع کا مشاہدہ کرلیں'' دنیاوی منافع یا اخروی منافع؟ فرمایا: تمام منافع۔۹

● ہشام بن حکم: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: کس فلسفہ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حج اور طواف خانہ خدا کا حکم دیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا یہاں تک کہ فرمایا انہیں امر ونہی کیا ہے جس میں دین کی اطاعت کا راز اور ان کے دنیاوی امور میں مصلحت کارفرما ہے۔ حج میں اللہ نے مشرق ومغرب

والوں کا اجتماع قرار دیا ہے تا کہ وہ ایک دورے سے آشنائی حاصل کریں اور ہر گروہ ایک شہر سے دوسرے شہر اپنی تجارت کے سامان لے جا کے منفعت حاصل کرے اور کرایہ پر کام کرنے والے اور اونٹوں کو سواری کے لئے دینے والے اس کے ذریعہ سے فائدہ اٹھائیں، اس کے علاوہ آثار رسول کی زیادہ معرفت حاصل ہو اور ان کے اخبار (سنت و سیرت) کی شناخت پیدا ہو، ان کی یاد تازہ ہو اور انہیں فراموش نہ کر دیا جائے اور اگر ہر گروہ اپنے ہی شہر و دیار پر بھروسہ کرتا اور وہیں کے مال تک محدود ہوتا تو سب ہلاک ہو جاتے اور شہر تباہ و برباد ہو جاتے، مال و سامان تجارت کی نقل و حرکت اور اس سے منفعت کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور (ایک دوسرے کے) حالات سے آگاہی نہ ہو پاتی یہ ہے فلسفہ حج ۔۱۰

- امام جعفر صادق علیہ السلام: جب تک خانہ کعبہ قائم ہے دین اسلام بھی قائم رہے گا ۔۱۱
- جناب فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا: اللہ تعالیٰ نے ایمان کو شرک سے پاک وصاف ہونے کے لئے اور حج کو دین کی (ہر سال) جلوہ نمائی اور تقویت کے لئے (لوگوں پر) فرض کیا ہے ۔۱۲

تارک حج:

الف: کافر ہے:

قرآن مجید:

''اس میں کھلی ہوئی نشانیاں مقام ابراہیمؑ ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ ہو جائے گا اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس راہ کی استطاعت رکھتے ہو اور جو کافر ہو جائے تو خدا تمام عالمین سے بے نیاز ہے'' ۱۳

احادیث شریفہ:

- رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مولا علیؑ کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے علی! مستطیع ہوتے ہوئے حج کا ترک کرنے والا کافر ہے اللہ کا ارشاد ہے: ''اس میں کھلی ہوئی نشانیاں مقام ابراہیمؑ ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ ہو جائے گا اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس راہ کی استطاعت رکھتے ہو اور جو کافر ہو جائے تو خدا تمام عالمین سے بے نیاز ہے''۔ اے علی! جو حج میں یہاں تک تاخیر

کرے کہ مرجائے خداوند متعال اسے بروز قیامت یہودی یا مصرانی اٹھائے گا۔۱۴

- رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: جس کے پاس زاد راہ اور سواری ہو جو اسے خانہ خدا تک پہنچادے اس کے باوجود حج نہ کرے تو اس کے لئے کوئی فرق نہیں کہ یہودی مرے یا نصرانی (مسلمان نہیں مرے گا) اس بات کا اشارہ خدا نے اپنی کتاب میں بھی کیا ہے۔۱۵

''اس میں کھلی ہوئی نشانیاں مقام ابراہیمؑ ہے اور جو اس میں داخل ہوجائے گا وہ محفوظ ہوجائے گا اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس راہ کی استطاعت رکھتے ہو اور جو کافر ہوجائے تو خدا تمام عالمین سے بے نیاز ہے''۔

- رسول خدا ﷺ: جسے ظاہری ضرورت یا سلطان ظالم یا باز رکھنے والا مرض حج کرنے سے مانع نہ ہو پھر بھی وہ حج نہ کرے اور حج کئے بغیر مرجائے تو اسے اختیار ہے چاہے تو یہودی ہو کے مرے یا نصرانی ہو کر۔۱۶

- رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: دائے لوگو! اللہ تعالیٰ نے استطاعت رکھنے والے پر حج کو واجب کردیا ہے اور جو نہ کرے وہ چاہے جس حال میں ہو چاہے یہودی ہو کر یا نصرانی ہو کر یا مجوسی ہو کر مرجائے مگر یہ کہ اس کو باز رکھنے والا مرض لاحق ہو یا ظالم حکمراں کی طرف سے روک ہو آگاہ ہو جاؤ کہ تارک حج کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی اور وہ میرے حوض پر وارد نہیں ہوگا، ہوشیار رہو (کیا) میں نے (یہ پیغام) نہیں پہنچادیا ہے؟۔۱۷

ب: تارک شریعت ہے:

- امام جعفر صادق علیہ السلام: اگر انسان اتنی قدرت رکھتا ہو کہ جس سے حج کرسکتا ہے پھر وہ قدرت اس کے ہاتھ سے نکل جائے اور اس کے پاس ایسا کوئی کام بھی نہ ہو جو عذر کے طور پر پیش کرسکے تو ایسے شخص نے شریعت اسلامیہ کا ایک اہم کام چھوڑ دیا ہے۔۱۸

☆امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایسے انسان نے کے بارے میں سوال ہوا کہ جو حج کو ٹال دیتا ہے اور اس کے پاس سوائے تجارت کی مشغولیت یا قرض کے اور کوئی چیز پر جانے سے مانع نہیں ہے؟ امامؑ نے فرمایا: اس کا عذر قبول نہیں ہے اسے حج کرنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے اگر وہ مرجائے تو گویا اس نے شریعت اسلام کا ایک اہم حکم چھوڑ دیا ہے۔۱۹

● امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ارشاد خداوندی: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں کے بارے میں خبر دیں جو اپنے اعمال میں بدترین خسارہ میں ہیں؟ (۲) کے بارے میں فرمایا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جو واجب حج میں تاخیر کرتے ہیں اور اسے آئندہ پر ٹال دیتے ہیں ۔۲۰

ج۔موت کے وقت (کافروں کی طرح) واپسی کی خواہش:

● امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب آیت کریمہ ﴿فاصدّق واکن من الصالحین﴾ ۲۱ کے متعلق سوال ہوتو آپ نے فرمایا: (اصدّق)، صدقہ سے ہے یعنی صدقہ وخیرات کرسکوں (واکن من الصالحین) اور نیک لوگوں میں ہو جاؤں یعنی حج کروں ۔۲۲

● ابن عباس: ''جس شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ جو خانہ خدا کا حج کرنے کے لئے وہاں تک پہنچادے یا اس کے اوپر زکوٰۃ واجب ہوگئی ہو لیکن وہ (حج) نہ کرے (یا زکوٰۃ ادا نہ کرے) تو موت کے وقت (دنیا میں) واپسی کی خواہش کرے گا۔

ایک شخص نے اعتراض کیا: اے ابن عباس! خدا کا خوف کرو! واپسی کی خواہش صرف کفار کرتے ہیں۔ انم عباس نے کہا: میں تیرے لئے قرآن کی آیت پڑھے دیتا ہوں! ''اے ایمان لانے والو! تمہارے مال اور اولاد تمہیں ذکر خدا سے غافل نہ کریں''۔ ''اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آ کھڑی ہو جو ہم نے تمہیں زرق دے رکھا ہے اس میں انفاق کرو......اور جو کچھ تم لوگ انجام دیتے ہو خدا اس سے خوب واقف ہے'' ۲۳ ۔۲۴

● ابوبصیر: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے آیت کریمہ: ''جو اس (دنیا) میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں اندھا ہوگا بلکہ گمراہ تر ہوگا''۔۲۵ کے متعلق سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا: اس سے وہ شخص مراد ہے جو حج اسلام (واجب حج) میں اتنی تاخیر کرے کہ اسے موت آجائے ۔۲۶

● ابوبصیر: میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جو صحت مند اور ثروت مند ہوتے ہوئے حج نہ کرے اور مرجائے تو وہ اللہ کے اس جملے کا مصداق ہے: اور ہم اسے بروز قیامت اندھا اٹھائیں گے ۔ میں نے عرض کیا: سبحان اللہ! اندھا!؟ ۲۷ فرمایا: ہاں! اندھا اس لئے کہ اللہ نے اسے راہ حق سے اندھا کر دیا ہے۔۲۸

● امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ: جو اس (دنیا) میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا

ہوگا بلکہ گمراہ تر ہوگا۔اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حج میں اتنی تاخیر کرے کہ مرجائے اور حج نہ کرے، ایسا شخص اندھا ہے یعنی فرائض الٰہی میں سے ایک اہم فریضہ ادا کرنے سے اندھا ہوگیا ہے۔۲۹

انبیاء اور حج بیت اللہ

(حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت خضرؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت سلیمانؑ، حضرت یونسؑ، حضرت عیسیٰؑ)

● زرارہ: خانہ کعبہ کے متعلق امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کیا ہمارے نبی کے مبعوث ہونے سے پہلے خانہ خدا کا حج کیا جاتا تھا؟ امام نے فرمایا: ہاں! وہ مخالفین نہیں جانتے تھے کہ لوگ حج کیا کرتے تھے اور ہم تمہیں بتلاتے ہیں کہ حضرت آدم حضرت نوح اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے بھی جن وانس اور طیور کے ساتھ خانہ کعبہ کا حج کیا ہے، حضرت موسیٰؑ نے سرخ اونٹ پر سوار ہوکر حج کیا ہے وہ کہتے تھے: لبیک لبیک اس لئے کہ خدا نے فرمایا ہے: سب سے پہلا گھر جسے لوگوں کے لئے قرار دیا گیا وہ بکہ میں ہے جو عالمین کے لئے مبارک اور ہدایت ہے۔۳۰۔۳۱

● امام جعفر صادق علیہ السلام: حضرت آدمؑ نے جب منیٰ سے کوچ کیا تو ملائکہ نے آپ سے ملاقات کی فرشتوں نے کہا: اے آدم علیہ السلام! آپ کا حج قبول ہو؟ معلوم ہو کہ ہم نے اس گھر کا حج آپ سے دو ہزار سال پہلے انجام دیا ہے۔۳۲

● امام علی رضا علیہ السلام: اپنے آباء واجداد طاہرین علیہم السلام سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے امیر المومنین سے سوال کیا: حضرت آدمؑ نے کتنی مرتبہ حج کیا؟ امامؑ نے فرمایا: ستر حج وبھی پا پیادہ جب پہلا حج کر رہے تھے تو آپ کے ساتھ ایک شکاری باز (لٹورا) تھا۔۳۳ جو آپ کو پانی کی جگہوں کی راہنمائی کیا کرتا تھا وہ باز آپ کے ساتھ جنت سے باہر آیا تھا، آپ کو باز اور ابابیل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔۳۴......ایک دوسرا شخص کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: اہل آسمان میں سب سے پہلے کس نے حج کیا ہے: امامؑ نے فرمایا: حضرت جبرئیل نے۔۳۵

● ابن عباسؓ: جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے لئے وادی عسفان سے عبور کیا تو فرمایا: اے ابوبکر! یہ کون سی وادی ہے؟ کہا: وادی عسفان، آنحضرت نے فرمایا: حضرت ہودؑ اور حضرت صالح بھی اپنے سرخ

اونٹوں پر یہاں سے گزرے ہیں ان کا لگام لیف خرما (کھجوری کی چھال سے بنی ہوئی) تھی اور ان کا لباس عبا تھی اور ان کی رداء دھاری دار کپڑے کی تھی وہ تلبیہ کہتے ہوئے بیت عتیق (خانہ کعبہ) کا حج کرتے تھے۔ ۳۶

- امام جعفر صادق علیہ السلام: حضرت ابراہیمؑ نے لوگوں کے درمیان حج کا اعلان کیا اور فرمایا: اے لوگو! میں ابراہیم خلیل خدا ہوں اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اس کے پاس آ کر اس کا حج کرو لہذا تم اس کا حج کرو، قیامت تک جو لوگ حج کریں گے ان سب نے اس آواز پر لبیک کہی اور سب سے پہلے لبیک کہنے والا شخص یمن کا رہنے والا تھا۔ حضرت امراہیمؑ نے اپنے اہل وعیال کے ہمراہ حج کیا تھا۔ ۳۷

- امام علی رضا علیہ السلام: حضرت خضرؑ نے آب حیات پی لیا ہے لہذا صور پھونکنے تک انہیں موت نہیں آئے گی وہ ہمارے پاس آتے ہیں اور سلام کرتے ہیں، ہم ان کی آواز سنتے ہیں لیکن ان کے جسم کو نہیں دیکھتے وہ جہاں بھی یاد کئے جاتے ہیں وہاں حاضر ہوتے ہیں لہذا تم میں سے جو بھی ان کا تذکرہ کرے اسے چاہئے کہ ان کے اوپر سلام کرے، وہ ہر سال حج میں حاضر ہوتے ہیں اور تمام مناسک حج بجالاتے ہیں، میدان عرفہ میں کھڑے ہوتے ہیں اور مومنین کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ عنقریب ان کے ذریعہ ہمارے قائم کی زمانہ غیبت میں وحشت کو انس میں اور تنہائی کو ہمراہی میں بدل دے گا۔ ۳۸

- امام محمد باقر علیہ السلام: حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے ستر نبیوں کے ساتھ حج کیا کہ ان کے اونٹوں کی مہار کھجور کی چھال سے بنی ہوئی تھی وہ لبیک کہتے تھے تو پہاڑ ان کا جواب دیتے تھے، حضرت موسیٰؑ کے دوش پر قطوانی (سوت کی بنی) عبائیں تھی، آپ کہہ رہے تھے: لبیک تیرا بندہ اور تیرے بندہ کا بیٹا آیا ہے۔ ۳۹

- امام محمد باقر علیہ السلام: حضرت سلیمان پیغمبر نے جنات، انسانوں پرندوں اور ہواؤں کے ساتھ خانہ خدا کا حج کیا اور کعبہ پر مصر کے بنے سفید اور نرم کپڑے کا پردہ لگایا۔ ۴۰

- ابن عباس: ''ہم جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے کہ ہمارا گزر ایک وادی سے ہوا جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ کون سی وادی ہے؟ لوگوں نے کہا: وادی ازرق (نیلی گھاٹی) آنحضرت نے فرمایا: گویا میں حضرت موسیٰ کو دیکھ رہا ہوں کہ اپنی دو انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالے درد بھری آواز میں ۴۱ تلبیہ کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ پھر ہم چلے اور ایک ٹیلہ پر پہنچے تو

آنحضرت نے پوچھا: یہ کون سا ٹیلہ ہے؟[۴۲] لوگوں نے کہا ''ہرشیٰ''[۴۳] یا ''لفت''[۴۴] ہے۔ آپ نے فرمایا: گویا میں حضرت یونسؑ کو دیکھ رہا ہوں کہ سرخ ناقہ پر سوار صوف (اون) کا جبہ پہنے ہوئے اور ناقہ کی مہار کھجور کی چھال کی بنی ہوئی ہے،[۴۵] اس وادی سے تلبیہ کہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔[۴۶]

- امام جعفر صادق علیہ السلام: حضرت یونسؑ ''روحاء''[۴۷] کے کناروں سے یہ کہتے ہوئے گزرے: ''لبیک ، اے بڑی بڑی مصیبتوں کو دور کرنے والے! لبیک'' اور حضرت عیسیٰؑ ''روحاء'' کے کناروں سے یہ کہتے ہوئے گزرے: ''لبیک، تیرا بندہ اور تیری کنیز کا فرزند (تیرے در پر آ رہا ہے) لبیک'' اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''روحاء'' کے کناروں سے یہ کہتے ہوئے گزرے: ''لبیک، اے بلندیوں کے مالک! لبیک''[۴۸]

....

۱) الحج: ۲۸

۲) سنن ابی داوود : ۲/ ۱۷۹/ ۱۸۸۱ عن عائشہ، ودیکھیے عوالی اللالی: ۱/ ۳۲۳/ ۶۰

۳) نہج البلاغہ: خطبہ ۱

۴) الدمث: اللین ۔ ولوشل: الماء القلیل یتحلب من صخرۃ اومن جبل یقطر منہ قلیلا قلیلا (المحیط اللغۃ: ۹/ ۲۸۴ وج ۷/ ۳۸۰)

۵) علل الشرایع: ۴۱۱/ ۱، معانی الاخبار: ۰

۶) تفسیر الطبر ی: ۱۰/ الجزء ۱۷/ ۱۴۷ عن جابر، وفی الطریق آخر عن الامام الباقر علیہ السلام قال: ''المغفر ۃ''

۷) الکافی: ۴/ ۲۶۳/ ۴۶

۸) الکافی: ۴/ ۴۲۲/ ۱۔

۹) علل الشرائع: ۴۰۴/ ۵، وص ۲۷۳/ ۹ نحوہ۔

۱۰) الکافی: ۴/ ۲۷۱/ ۴ عن ابی بصیر۔

۱۱) الفقیہ: ۳/ ۵۶۸/ ۴۹۴۰ عن زینب، نہج البلاغہ: الحکمۃ ۲۵۲، اور نہج البلاغہ کی بعض شرحوں میں ''تقویت دین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے ، دیکھئے کتاب مصادر نہج البلاغہ ۴/ ۱۹۴۔

۱۲) الحج: ۲۷

۱۳) آل عمران: ۹۷۔

۱۴) الفقیہ: ۴/ ۳۶۸/ ۵۷۶۲۔

۱۵)سنن ترمذی:۳/۳/۶/۱۷۶/۸۱۲عن الحارث عن الامام علیؑ

۱۶)سنن الدارمی:۱/ ۴۵۵/۳۳/۱۷،حلیۃ الاولیاء:۹/ ۲۵۱،الفردوس:۳/ ۶۳۵/ ۵۹۵۱کلھاعن ابی امامۃ؛الکافی:۴/ ۲۶۸/۱ وص ۲۶۹/۵الفقیہ:۲/ ۴۴۷/ ۹۳۵،ثواب الاعمال:۲۸۱/۲کلھاعن ذریح الحاربی عن الامام صادقؑ

۱۷)تنبیہ الغافلین:۵۵۴/ ۸۹۸عن عبدخیرعن الامام علی علیہ السلام ۔

۱۸)التھذیب:۵/ ۱۸/۵۴،الفقیہ:۲/ ۴۴۸/ ۲۹۳۶،دعائم الاسلام:۱/ ۲۸۸ کلاھمانحوہ وکلھاعن الحلبی۔

۱۹)دعائم الاسلام:۱/ ۲۸۸۔

۲)الکھف:۱۰۳۔

۳)عوالی اللالی:۲/ ۸۶/۲۳۲عن محمد بن افضل،نورالثقلین:۳/ ۳۱۱/ ۲۴۷۔

۴)المنافقون:۱۰۔

۵) الفقیہ:۲/۲۲۰دیکھئے تفسیرالقمی:۲/ ۳۷۰۔

۶) المنافقون:۹۔۱۱ ۔

۷)سنن ترمذی۵/ ۴۱۸/ ۲۳۱۶،درالمنثور:۸/ ۱۷۹۔

۸)الاسراء:۲۷۔

۹)الکافی:۴/ ۲۶۹،تفسیرالعیاشی:۲/ ۳۰۵/ ۱۲۷عوالی اللالی:۴/ ۲۶/ ۸۰نحوہ

۱۰)طہ:۱۲۴

۱۱) الکافی:۴/ ۲۶۹/ ۶،التھذیب:۵/ ۱۸/ ۵۱،۵۳عن معاویہ بن عمارنحوہ وفیہ(طریق الجنۃ)،الفقیہ:۲/ ۴۴۷/ ۲۹۳۴وفیہ(طریق الخیر)

۱۲)تفسیرالقمی:۲/ ۲۴،تفسیرالعیاشی:۲/ ۳۰۵/ ۱۲۷عن ابی بصیرنحوہ۔

۳۰)آل عمران:۹۶۔

۳۱) تفسیرالعیاشی:۱/ ۱۸۶/ ۹۲۔

۳۲)الکافی:۴/ ۱۹۴/ ۴،معاویۃ بن عمار،الفقیہ:۲/ ۲۳۰/ ۲۲۷۵

۳۳)المنجد :۴۲۲

۳۴)المنجد:۱۸۷

۳۵)عیون الاخبارالرضاعلیہ السلام:۱/ ۲۴۳/ ۱،علل الشرائع:۵۹۴/ ۴۴وفیہ(ثلاثون)بدل(سبعین)کلاھماعن احمد بن عامرالطائی۔

۳۶)مسند ابن حنبل:۱/۵۰۱/ ۲۰۶۷،الترغیب والترہیب:۲/ ۱۸۵/ ۷،الدرالمشور :۳/ ۴۸۷/ ۱۸نحوہ

۳۷)الکافی:۴/ ۲۰۵/۴عن عقبۃ بن بشیر

۳۸)کمال الدین:۳۹۰/ ۵عنالحسن بن علی بن فضال۔

۳۹)الکافی:۴/۲۱۴/ ۸عن زید الشحام عن رواہ وص۲۱۳/۳عن ابی بصیر،علل الشرائع:۴۱۸/ ۵،۶عن جابر وابی بصیر وکلہانحوہ،ودیکھئے المعجم الکبیر:۱۱/۳/۱۲۲۸۳

۴۰)الکافی:۴/۲۱۳/ ۶،الفقیہ :۲/ ۲۳۵/ ۲۲۹۵ کلاہماعن زراۃ۔

۴۱)الجوار:رفعالصوت والاستغاثۃ (النہایۃ ۱/۲۳۲)

۴۲)تاج العروس:۱۹/ ۲۵۷۔

۴۳)معجم البلدان:۵/ ۳۹۷،لسان العرب:۶/۳۶۳۔

۴۴)معجم البلدان:۵/۲۰،لسان العرب:۲/۸۶

۴۵)لسان العرب:۱/ ۳۶۵۔

۴۶)سنن ابن ماجۃ:۲/۹۶۵/ ۲۸۹۱۔

۴۷)تاج العروس:۴/۱۲۴وص ۶۷۔

۴۸)الکافی:۴/۲۱۳/۴علل الشرائع:۴۱۹/ ۴۷کلاہماعن ہشام بن الحکم۔

فقہ مقارن کا مختصر تعارف

محمد رضا ضمیری (محقق ومؤلف)
ترجمہ: سید شاہد حسین رضوی

پیش لفظ

موازنہ اور تطبیق کی شکل میں علمی مسائل کی تحقیق ایک عام طریقہ ہے جس پر قدیم الایام سے علمائے اسلام کی توجہ رہی ہے اور اس سے فائدے بھی ہوئے ہیں، اسلامی فقہ پر تطبیقی وتحلیلی بحث وگفتگو اور اسلامی مذاہب کے نظریات کا جائزہ لینا دور حاضر میں اسلامی معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔ مسلمانوں کے اعمال وکردار کو سنوارنے میں فقہ کے اہم کردار کے پیش نظر تطبیقی تحقیقات مسلمانوں کو باہم زیادہ سے زیادہ قریب کرسکتی ہیں۔ اور فتنوں وخطرات کے مقابل انھیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرسکتی ہیں۔

فقہ مقارن کے مباحث کی قدمت کے باوجود، اس کے ابتدائی مسائل، طریقہ کار اور اس کی تاریخ کے سلسلہ میں کم گفتگو کی گئی ہے، فقط چند مصنفین نے بطور اختصار اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا فقہ مقارن کے اہم مسائل پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کے طریقہ کار پر گفتگو کرنا ضروری ہے، اس مقالہ میں اختصار کے ساتھ حسب ذیل

مسائل پر گفتگو کی جائے گی:

(۱) فقہ مقارن کی تعریف

(۲) فقہ مقارن کی ضرورت اور اس کا فائدہ

(۳) فقہ مقارن کا موضوع

(۴) فقہ مقارن کے مقدماتی علوم

(۵) فقہ مقارن کی (شیعہ، سنی) تاریخ

(۶) اختلاف فقہا کے اسباب

(۷) تطبیق کا طریقہ اور اصول

(۸) کتابوں کا تعارف

۱۔ فقہ مقارن کی تعریف

لغت میں فقہ مقارن کے لئے مختلف الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، منجملہ: **علم الخلاف، فقه مقارن، فقه تطبيقى** اور **علم الجدل و غيره**، ان الفاظ سے مراد کیا ہے یہ جاننے کے لئے ہم بعض اہم الفاظ کی مختصر توضیح پیش کررہے ہیں:

الف) لفظ ((خلاف)) لغت میں یہ لفظ ((اتفاق)) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کتاب ''مصباح''، ''المنیر'' میں لکھا ہے:

> **" خالفته (مخالفة) و خلافا و تخالف القوم و اختلفوا اذا ذهب كل واحد الىٰ خلاف ما ذهب اليه الآخرو هو ضد الاتفاق"**

میں نے اس کی مخالفت کی اور امت نے آپس میں اختلاف کیا جب ان میں سے ہر ایک دوسرے کے برخلاف جانے لگے اور یہ اتحاد کی ضد ہے۔ الف

اور راغب نے مفردات میں لکھا ہے:

> **" الاختلاف و المخالفه ان ياخذ كل واحد طريقا غير طريق الآ خر فى حاله وقوله والخلاف اعم من الضد لانّ كل ضدين مختلفان و ليس كل مختلفين ضدين و لما كان الاختلاف بين النّاس فى القول وقد**

يقتضى التنازع استعير ذالک للمنازعة والمخالفة ''[1]

اختلاف اور مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے قول وفعل میں دوسرے کے برخلاف راستہ اپنائے اور لفظ ((خلاف)) لفظ ((ضد)) سے عام تر ہے؛ اس لئے کہ دو ضد ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں لیکن دو مختلف امر کا آپس میں ضد ہونا ضروری نہیں ہے اور چونکہ لوگوں کے درمیان اختلاف گفتگو کے سبب ہوتا ہے جو کبھی کبھی نزاع میں بھی بدل جاتا ہے لہذا لفظ ((خلاف)) نزاع اور مخالفت کے معنی میں عاریۃً استعمال ہوتا ہے۔

ب) لفظ ((مقارن)) یہ لفظ ((قرن)) سے ہے جس کے معنی لغت میں دو یا چند چیزوں کو ملانے اور جمع کرنے کے ہیں جیسا کہ کتاب ((مصباح المنیر)) میں ہے:

'' قرن بين الحج والعمره من باب قتل و فى لغة من باب ضرب، جمع بينهما فى الاحرام والاسم القران بالكسر ''[2]

حج وعمرہ کو ملا دیا یہ لفظ ((قتل)) کے وزن پر ہے دوسری لغت میں ضرب کے وزن پر ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ حج وعمرہ کے لئے ایک ہی احرام باندھا اور دونوں کو ایک ساتھ انجام دیا۔

راغب اصفہانی کتاب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں:

'' الاقتران كالازدواج فى كونه اجتماع شيئين اور اشياء فى المعانى قرنت البعير بالبعير جمعت بينهما ''[3]

اقتران چونکہ دو یا چند چیز کو معنی کے اعتبار سے ملانا اور جمع کرنا ہے لہذا ازدواج کے مانند ہے جب کہا جائے کہ میں نے اونٹ کو اونٹ کے قرین کیا یعنی دونوں کو جمع کیا اور ایک ساتھ ملا دیا۔

ج) لفظ ((تطبیق)) یعنی دو چیزوں کا آپس میں مقابلہ کرنا جس کے ذریعہ دونوں کے مشترک اور مختلف نقاط حاصل ہوں اور علمی میدان میں بھی ایک نظریئے کا دوسرے نظریئے سے مقابلہ کرتے ہیں تاکہ متفق اور مخالف نکات تک رسائی حاصل کر کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکیں۔

د) لفظ ((فقہ)) کے معنی لغت میں اچھی طرح سمجھنے کے ہیں اس کے استعمال کے مواقع سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لفظ فقہ اور فہم میں فرق ہے۔

فقہائے کرام کی اصطلاح میں فقہ یعنی ''تفصیلی دلیلوں کے ذریعہ شرعی احکام کا علم حاصل کرنا'' ہے۔[4]

۲۔فقہ مقارن کی اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں فقہ مقارن کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں ہم یہاں پر صرف چار تعریفیں بیان کر رہے ہیں:

۱) ''الفقه المقارن هو جمع الآراء المختلفة فى المسائل الفقهية على صعيد واحد دون اجزاء موازنة فيها''

ایک ہی موضوع پر فقہی مسائل میں مختلف نظریات کو بغیر کسی موازنہ ومقابلہ کے جمع کرنا۔

۲)''هو جمع الآراء المختلفة و تقسيمها والموازنة بينها بالتماس ادلتها و ترجيح بعضها على بعض'' ۵

مختلف نظریات کو جمع کرنے کے بعد انھیں الگ الگ کر کے دلیلوں کے مطابق ان کا موازنہ ومقابلہ کرنا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا۔

۳) ''نوع خاص من دراسة الفقه و يراد به العلم بالاحكام الشرعية فى المختلف الابواب من حيث معرفة آراء الائمة والفقها والعلماء و مذاهبهم المتفقة او المختلفة فيها مع بيان ادلتهم و قواعدهم الاصولية و جهات نظرهم اللتى كانت منشاهذا الاختلاف مع سبر هذه الادلة و موازنة بعضها ببعض و اختيار اقربها الى الحق و اولاها بالقبول'' ٦

فقہ مقارن ایک مخصوص قسم کی فقہی تحقیق ہے جس کا مطلب مختلف احکام شرعی سے واقفیت ہے اس طرح کہ ائمہؒ، فقہا اور علماء کے نظریات اور ان کے مخالف ومتفق مکتب فکر سے ان کی دلیلوں کے ساتھ علم حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ اصولی قواعد وضوابط اور ان کے نظریات کے مختلف ہونے کا سرچشمہ بھی معلوم ہو جائے تا کہ انھیں دلیلوں کے ذریعہ ان نظریات کا موازنہ کر کے حق وحقیقت سے قریب اور اولیٰ نظریہ وقول کو منتخب کر سکیں۔

۴) ''فالفقه المقارن مصطلح حديث يقصد به الموازنة بين آراء الفقها و بين اسباب الاختلاف فيها و كل منها من القوة والصحة'' ۷

فقہ مقارن ایک نئی اصطلاح ہے جس کا مقصد فقہا کے نظریات کا موازنہ کرنے کے بعد ان کے درمیان

اختلاف کے اسباب بیان کرنا اور ہر ایک کی صحت وقوت کے حدود بیان کرنا ہے۔

خلاصہ کلام:

ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری تعریف سب سے جامع تعریف ہے۔

۳۔ فقہ مقارن کا موضوع

آخوند خراسانی نے موضوع کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے ((**هو كل ما يبحث فيه عن عوارضه الذاتية**)) یعنی موضوع، ہر وہ چیز ہے جس میں اس کے ذاتی عوارض سے بحث ہو، اب دیکھنا یہ ہے کہ فقہ مقارن کا موضوع کیا ہے۔ مذکورہ تعریفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر تعریف کے لحاظ سے فقہ مقارن کا موضوع بھی مختلف ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ایک تعریف کے مطابق اس کا موضوع ''فقہی مسائل میں مجتہد حضرات کے نظریات ہیں'' تو دوسری تعریف کے لحاظ سے اس کا موضوع ''فقہی مسائل میں مجتہد حضرات کے نظریات کا موازنہ کر کے ایک نظریہ کو دوسرے نظریہ پر ترجیح دینا ہے''۔

۴۔ فقہ مذہبی اور فقہ مقارن میں فرق

ہر اسلامی مذہب کی مخصوص فقہ ہے مگر اسی مذہب کے فقہا کے درمیان بھی مختلف قسم کے نظریاتی اختلاف نظر آتے ہیں، جس فقہ میں کسی ایک مذہب کے فقہا کے نظریات کا جائزہ لیا جاتا ہے اسے فقہ مذہبی کہا جاتا ہے جیسے: کتاب ''مختلف الشیعہ''، جس میں علامہ حلیؒ نے اپنے دور تک کے تمام فقہی اختلافات کو جمع کیا ہے۔ فقہ مقارن اور فقہ مذہبی میں فرق ہے اس لئے کہ فقہ مقارن میں مختلف مذاہب کے فقہا کے نظریات جمع کئے جاتے ہیں اور اس پر گفتگو کی جاتی ہے جبکہ فقہ مذہبی میں ایک مخصوص مذہب کے فقہا کے نظریات جمع کر کے اس پر گفتگو کی جاتی ہے۔ یعنی فقہ مقارن میں مذہب کے بیرونی اختلاف پیش نظر ہوتے ہیں جبکہ فقہ مذہبی میں اندرونی اختلاف مد نظر ہوتے ہیں۔

صاحبان نظر کے نظریات

بعض محققین فقہ مقارن اور فقہ مذہبی میں فرق کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

" فموضوع علم الفقه. فيما نرى. هو نفس الاحكام الشرعية او الوظائف العلمية من حيث التما سها من ادلتها وهذا موضوعه آراء

المجتهدين فيها من حيث الموازنة و التقييم ومن هذا الاختلاف فی طبیعة الموضوع نشا بینهما فارق منهجی فالفقیه غیر ملزم بعرض الآراء الاخری و مناقشتها و انما یکتفی بعرض ادلته الخاصة التی التمس منها الحکم بخلاف المقارن و الخلافی فهما ملزمان باستعراض مختلف الآراء والادلة و اعطاء الرای فیها فالفارق بینهما اذن فارق جذری و ان تشابها فی طبیعة البحوث " ۸

ہماری نظر میں علم فقہ کا موضوع وہی شرعی احکام اور فرائض دینی ہیں جو دلیلوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، لیکن فقہ مقارن کا موضوع فقہا کے نظریات کی تحقیق اور ان کی چھان بین ہے لہٰذا موضوع میں اختلاف کے سبب ان دونوں کی راہ وروش میں بھی فرق پیدا ہوا، اسی وجہ سے فقیہ کے لئے دوسرے نظریات کو بیان کرکے ان پر تنقید کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنی انھیں دلیلوں کو بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ کسی حکم تک اس کی رسائی ہوئی ہے، لیکن اس کے برخلاف فقیہ مقارن یا فقیہ خلافی کا فریضہ ہے کہ وہ مختلف نظریات کو ان کی دلیلوں کے ساتھ پیش کرکے اپنا نظریہ بیان کرے، تو پتہ چلا کہ فقہ مقارن اور فقہ مذہبی کے مابین بنیادی فرق ہے ہر چند دونوں بحث کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔

گویا علم فقہ کا درجہ فقہ مقارن سے آگے ہے اس لئے کہ فقہ میں شرعی احکام اور دینی فریضے کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جبکہ فقہ مقارن میں کسی حکم کے استنباط کے بعد دوسرے مذاہب کے فقہا کے نظریات سے مقابلہ کرکے اپنے مذہب کے حکم کی ترجیح کے لئے دلیلیں پیش کی جاتی ہیں اور تاریخ بھی گواہ ہے کہ علم خلاف (فقہ مقارن) علم فقہ کے بعد وجود میں آیا ہے۔

اہل سنت کے ایک عالم رقمطراز ہیں:

" فالفقه المذهبی طوعا لتعریف المذهب هو الفقه الذی یعبر عن منحی مذهب من المذاهب الفقهیه المعروفة فیدرس المسائل والفروع وفقا لاصول ذالک المذهب فی الاجتهاد دون التعرض غالبا لآراء الفقهاء من مختلف المذاهب و قد عرفت الحیاة الفقهیه للفقه المذهبی قبل الفقه المقارن فالمقارنة بین الآراء لا تکون الّا بعد

صدورها "۹

خود مذہب کی تعریف کے پیش نظر، فقہ مذہبی وہ فقہ ہے جس میں اسلامی مذاہب میں سے کسی مخصوص ومشہور مذہب کی راہ وروش بیان کی جاتی ہے اور اجتہاد کے دوران کسی دوسرے مذہب کے فقہا کے نظریات کا تذکرہ کئے بغیر صرف اسی مخصوص مذہب کے اصول وقوانین کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔ کہا گیا ہے فقہ مذہبی کی فقہی حیات فقہ مقارن کی تدوین سے پہلے کی ہے اس لئے کہ مختلف نظریات کے وجود کے بعد ہی مقابلہ اور بحث وگفتگو کا امکان ہے۔

۵۔ فقہ مقارن کے فائدے

یہاں پر فقہ مقارن کے چند فائدوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے:

۱) اسلامی فقہ کی گہرائیوں تک رسائی

۲) فقہ واصول فقہ کے میدان میں دوسروں کی فکر اور ان کے نتائج سے فائدہ اٹھانا

۳) تعصب سے ہٹ کر محققین کی عملی فکر کو جلا دینا

۴) دوسرے قوانین سے دین اسلام اور فقہی نظریات کو نزدیک کرنا۔۱۰

۵) فقہا کے درمیان اتفاق نظر واختلاف نظر کی شناخت کے بعد اختلاف کے سرچشمہ سے باخبر ہونا

۶) استنباط اور اجتہاد کے وقت ہر مذہب کے اماموں کے طریقہ کار کو سمجھنا

۷) فقاہت کا ملکہ حاصل کرنے میں مطابقت اور مقابلہ کی تاثیر۔۱۱

نووی شافعی، فقہ تطبیقی کے فائدے کے سلسلہ میں اس طرح رقمطراز ہیں:

" واعلم انّ معرفة مذاهب السلف بادلتها من اهم ما يحتاج اليه لانّ اختلافهم فى الفروع رحمة و بذكر مذاهبهم بادلتها يعرف المتمكن المذاهب على وجهها والراجح من المرجوح و يتّضح له و لغيره المشكلات و تظهر له الفوائد النفسيات و يدرّب الناظر فيها بالسؤال و الجواب و يتفتح ذهنه و يتميّز عند ذوى البصائر و الالباب و يعرف الاحاديث الصحيحه من الضعيفة والدلائل الراجحة من المرجوحه و يقوم بالجمع بين الاحاديث المتعارضات والمعمول بظاهرها من

المؤولات و لا یشکل علیه الا افراد من النادر " ۱۲؎

ما سلف کے نظریات کو ان کی دلیلوں کے ساتھ جاننا اس وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے، اس لئے کہ فروع دین میں ان کا اختلاف رحمت ہے اور ان کے نظریات کو دلیلوں کے ساتھ بیان کرنے سے محقق کو اس مذہب کی کما حقہ پہچان ہو جاتی ہے اور راجح و مرجوح کا فرق واضح ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے خود محقق اور دوسروں کی بھی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں اور نفسانی و اندرونی فائدے سامنے آجاتے ہیں، جس کے بعد تنقید کرنے والا سوال و جواب کرتا ہے اور اس کا ذہن کھل جاتا ہے اور صاحبان نظر کے نزدیک جانی پہچانی شخصیت بن جاتا ہے۔ صحیح احادیث کو ضعیف حدیثوں سے الگ کر کے قوی دلیلوں کو ضعیف دلائل سے جدا کرتا ہے، اور متضاد احادیث کو جمع کر کے اس کی تاویل کرنے کے بجائے ظاہر پر عمل کرتا ہے پھر بہت ہی کم افراد اس پر اعتراض کر پاتے ہیں۔

۶۔ فقہا کے نظریات میں اختلاف کے اسباب

اکثر اوقات ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ ایک ہی دین اور ایک پیغمبرؐ ہونے کے باوجود فقہاء کرام فقہی مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف نظریہ کیوں رکھتے ہیں آخر ان کے فتوؤں اور نظریات میں اختلاف کا سبب کیا؟ کیا ان کے اسباب کی شناخت حاصل کر کے اختلاف کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ فکر و نظر اور اعتقاد میں اختلاف ایک فطری امر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿**لو شاء ربک لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک و لذالک خلقهم**﴾ سورۂ ہود آیت ۱۱۸ و ۱۱۹۔

تمہارا پروردگار اگر چاہتا تو یقیناً لوگوں کو ایک امت ہی قرار دیتا (جبکہ اس نے نہ چاہا اسی لئے) لوگ ہمیشہ آپس میں پھوٹ ڈالا کریں گے مگر تمہارا پروردگار جس پر رحم فرمائے اور اسی لئے اس نے ان لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

فقہی مسائل میں علمائے اسلام اور علمائے شیعہ کا اختلاف ایک معقول اور فطری امر ہے اس لئے کہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک قطعی احکام دوسرے ظنی احکام، قطعی احکام میں اختلاف غیر معقول امر ہے لیکن ظنی اور غیر ضروری احکام میں چونکہ اجتہاد کیا جاتا ہے لہٰذا اختلاف عقل سے بعید بھی نہیں ہے اس لئے کہ سب کی فکریں ایک نہیں ہوتیں اور دینی نصوص سے ایک ہی مطلب نہیں نکالتیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہا کے نظریات میں

اختلاف کے اسباب کو سمجھا جائے تا کہ حقیقت تک رسائی ہو سکے۔

فتوؤں اور نظریات میں فقہا کے درمیان اختلاف کے اسباب کی تلاش بہت زمانہ سے ہے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب ابومحمد عبداللہ بن محمد بن سید بطلمیوسی (۴۴۴-۵۲۱) نے لکھی ہے ان کی کتاب کا نام " **الانصاف فی التنبیه علی الاسباب التی او جبت الاختلاف بین المسلمین فی آرائهم** " ہے۔[۱۳]

اس کے بعد جناب ابن رشد متوفا ۵۹۵ھ نے ان اختلاف کے چھ اسباب بیان کئے ہیں جن کی باز گشت سنت میں اختلاف کی طرف ہے، موصوف اس سلسلہ میں لکھتے ہیں: اختلاف کے اسباب چھ ہیں:

۱) الفاظ میں تردد (عام وخاص، دلیل خطاب)۔

۲) مفرد یا مرکب الفاظ کا مشترک ہونا۔

۳) اعراب میں اختلاف۔

۴) ایک لفظ میں حقیقت ومجاز کے لحاظ سے مردد ہونا۔

۵) ایک لفظ میں کا مطلق اور مقید کے لحاظ سے مردد ہونا۔

۶) دو چیزوں کے مابین ٹکراؤ اور تعارض۔[۱۴]

موصوف کے بعد ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "**رفع الملام عن الأئمة الاعلام**" میں انھیں تین اسباب کی طرف پلٹایا ہے:

۱) مجتہد کا یہ عقیدہ کہ فلاں حدیث پیغمبر اسلامؐ سے صادر نہیں ہوئی ہے۔

۲) مجتہد کا یہ عقیدہ کہ اس حدیث سے مراد فلاں مسئلہ نہیں ہے۔

۳) مجتہد کا کسی حکم کے منسوخ ہونے پر عقیدہ اس کے بعد انھوں نے ان تین اسباب کی دس شاخیں بیان کی ہیں جس کی باز گشت بھی سنت میں اختلاف کی طرف ہے۔ اس کے بعد شاطبی نے بطلمیوسی کی پیروی کرتے ہوئے کتاب "الموافقات" میں حقیقی اور ظاہری اختلاف کو جدا بیان کیا ہے اور آخر میں شاہ ولی اللہ دہلوی متوفا ۱۱۸۰ھ نے کتاب " الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں ابن تیمیہ کی ہی باتیں لکھی ہیں اور فقہی مکاتب کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱۔ اہل حدیث؛ ۲۔ اہل رائے بہر حال اس سلسلہ میں بہت سے نظریات موجود ہیں جن میں سے بعض کو ذیل میں بیان کررہے ہیں:

پہلا نظریہ

ڈاکٹر زحیلی نے کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' میں فقہا کے نظریات میں اختلاف کے چھ اہم اسباب لکھے ہیں:

۱) عربی الفاظ کے معنی میں اختلاف، جس کا سبب لفظ میں اجمالی، اشتراک اور تردد کا ہونا ہے۔

۲) روایات میں اختلاف؛ جس کے آٹھ فرعی اسباب ہیں مثال کے طور پر حدیث ایک فقیہ تک پہنچی اور دوسرے تک نہیں پہنچی، یا ایک کی سند قوی ہے دوسرے کی ضعیف ہے وغیرہ۔

۳) اجتہاد کے منابع میں اختلاف؛ مثلاً استحسان مصالح مرسلہ وغیرہ میں اختلاف۔

۴) اصول فقہ کے قواعد وقوانین میں اختلاف مثال کے طور پر بعض علما مفہوم کو حجت نہیں سمجھتے۔

۵) قیاس کے ذریعہ اجتہاد، اختلاف کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

۶) دلیلوں میں تعارض اور ٹکراؤ بہت سے اختلاف کا سبب یہی امر ہے۔

دوسرا نظریہ

ڈاکٹر عبدالفتاح کبارہ نے حسب ذیل اسباب بیان کئے ہیں:

۱) شرعی نصوص میں اختلاف جیسے: (قرائتوں کا اختلاف)۔

۲) **ما لا نص فیہ** (جن چیزوں کے لئے کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو) میں اختلاف، جس کے مختلف اسباب ہیں۔[15]

۱۔ حدیث سے ناواقفیت۔

۲۔ حدیث کے ثبوت میں شک۔

۳۔ مرسل حدیثوں سے استدلال۔

۴۔ خبر واحد کے سلسلہ میں مکاتب فکر۔

۵۔ دلیلوں کے مابین ظاہری ٹکراؤ۔

۶۔ عمومات قرآن کو سنت کے ذریعہ تخصیص دینا۔[16]

فقہ مقارن کے مقدماتی علوم

فقہ مقارن کے لئے بھی فقہ مذہبی کی طرح کچھ مقدماتی علوم جیسے ادبیات عرب، حدیث، رجال، علم مناظرہ، علم جدل وغیرہ کی ضرورت ہے تاکہ ایک فقیہ اپنے مخالف سے اچھی طرح اپنے مذہب کا دفاع کر سکے۔ دور حاضر کے ایک مصنف اس سلسلے میں رقمطراز ہیں: ''علم فقہ مقارن کو مختلف علم کی ضرورت ہوتی ہے جن میں سے بنیادی علم، اصول فقہ، منطق، علم بحث اور علم مناظرہ ہے۔۔۔ عالم اور فقیہ مقارن کو استنباط احکام کے قواعد و اصول سے واقفیت ہونا چاہئے بالکل اسی طرح کہ جیسے ایک مجتہد کو اسی کی ضرورت ہے اس فرق کے ساتھ کہ مجتہد کو استنباط اور اجتہاد کے لئے اس کی ضرورت ہے لیکن صاحب علم خلاف و مقارن کو ان مسائل کو محفوظ رکھنے کے لئے ان اصولوں کی ضرورت پڑتی ہے۔[۷۱]

فقہ مقارن کی تاریخ

علم خلاف اور فقہ مقارن پر فقہا کی توجہ قدیم زمانہ سے رہی ہے لیکن شیعہ اور اہل سنت کے یہاں تاریخی دور یکساں نہیں تھا لہٰذا شیعہ اور سنی دونوں لحاظ سے اس سلسلہ میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے:

الف: اہل سنت میں فقہ مقارن کے مراحل:

پہلا مرحلہ: پیدائش اور ابتدائی دور

فقہ مقارن کی اپنے ابتدا میں ایک فقیہ کے کسی خاص مذہب یا مدرسہ یا مکتب فکر سے وابستگی کی بنیاد پر ہوئی اور اس وقت یہ چیزیں تمام فقہی ابواب شامل نہیں تھی۔

ابوحنیفہ کے شاگرد ابو یوسف نے ''سیر اوزاعی'' کے رد میں ایک کتاب لکھی اور محمد بن حسین شیبانی نے اہل مدینہ کے مقابلہ میں ''**الحجة علی اهل المدینه**'' نامی ایک کتاب لکھی جس میں عراق اور مدینہ دونوں مکتب فکر کے نظریات کو اچھی طرح لکھ کر انھیں تطبیقی طور سے بیان کر کے ان کا موازنہ کیا ہے۔

ابن خلدون لکھتے ہیں: مذاہب کی پیدائش کے دور میں اپنے مذہب کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہر مذہب کے پیروکاروں کے مابین مناظرہ ہوتا تھا اور ہر ایک اپنے مذہب کی حقانیت کے لئے دلیلیں پیش کرتا تھا۔ یہ مناظرے سبھی شرعی اور فقہی مسائل کے سلسلہ میں ہوتے تھے۔ کبھی یہ اختلاف اور مناظرہ شافعی اور مالک کے مابین ہوتا تھا اور ابو حنیفہ دونوں میں سے کسی ایک کے موافق ہوتے تھے تو کبھی برعکس، ان مناظروں میں چاروں اماموں کی

دلیلیں پیش کی جاتی تھیں اس طرح یہ ایک علم کی صورت میں بدل گیا جو علم خلافیات کہا جانے لگا۔۱۸

دوسرا مرحلہ: تکمیلی دور

اس دور سے فقہ کا ہر باب فقہ مقارن میں شامل ہو گیا اس دور میں دفاع نہیں کیا جاتا تھا بلکہ کسی قول کو ترجیح دیئے بغیر مختلف نظریات واقوال کو جمع کیا جاتا تھا۔اس طرز فکر پر سب سے پہلی کتاب محمد جریر طبری نے لکھی جس کا نام ''اختلاف الفقہاء'' تھا۔ چوتھی صدی میں باب اجتہاد کے بند ہونے کے بعد علماء نے تین اہم ذمہ داریاں سنبھالیں:

۱۔تعلیل احکام، اسلامی مذاہب کے اماموں کے فتوے اور احکام کی علت تلاش کرتے تھے۔

۲۔ترجیح اقوال، اگر کسی مسئلہ پر امام مذہب اور شاگردوں یا مختلف علمائے مذہب کے مابین نظریاتی اختلاف ہوتا تو قوی ترین قول کو دلیل کے ساتھ بیان کرتے تھے۔

۳۔انتصار مذہب، اس دور کے فقہا اپنے نئے مذہب کے استحکام کی خاطر دو بنیادی کام انجام دیتے تھے:

الف) ائمہ مذہب کی فضیلت ومنقبت میں کتابیں لکھتے تھے۔

ب) فقہی مذاہب کے درمیان موجود اختلافات پر غور وخوص، اسی وجہ سے فقہ مقارن وعلم خلاف کے مباحث وسیع پیمانہ پر سامنے آنے لگے۔۱۹

تیسرا مرحلہ: فقہ مقارن کی حدود میں وسعت

چھٹیں صدی میں ابن رشد متوفا ۵۹۵ھ نے ''**بداية المجتهد و نهاية المقتصد**'' نامی کتاب لکھی جس میں طبری ہی کی طرح کسی نظریہ کو ترجیح دیئے بغیر مختلف نظریات کو جمع کر کے فقہا کے درمیان اختلاف کے اسباب تحریر کئے ہیں۔

نویں صدی سے فقہا نے ایک ہی مذہب کے علماء کے مابین نظریاتی اختلاف بیان کرنا شروع کر دیئے یہ اختلاف کبھی امام مذہب اور شاگردوں کے درمیان ہوتا تھا تو کبھی خود مختلف شاگردوں کے درمیان ہوتا تھا، حقیقت میں علماء کا مقصد قوی نظریہ کو مشخص کرنا تھا اس لئے کہ قضاوت یا فتوا دینے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی تھی، ابن عابدین کی کتاب ''**رد المختار**''اسی بارے میں ہے۔

مذاہب کے نظریات پر تطبیقی تحقیق زوروں میں ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں اور موسوعے سامنے آئے ہیں مثال کے طور پر کتاب ''**التشریع الجنایی فی الاسلام مقارنا بالتشریع الوضعی** " مولف عبدالقادر عودۃ یا موسوعہ جمال عبدالناصر وغیرہ۔

ب: شیعوں میں فقہ مقارن کے مراحل

پہلا مرحلہ: پیدائش اور ابتدائی دور

کسی مسئلہ میں تطبیقی نظریئے اور مختلف فکروں کو پیش نظر رکھنے کی اہل بیت علیہم السلام نے بڑی ہدایات فرمائی ہیں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

'' من استقبل وجود الآراء عرف مواقع الخطا '' [۲۰]

جو شخص مختلف نظریات کا استقبال کرتا ہے وہ غلط مواقع سے واقف ہو جاتا ہے؛ نیز فرماتے ہیں:

'' اضمم آراء الرجال بعضها الی بعض ثم اختراقربها الی الصواب و ابعد ها عن الارتیاب ''۔[۲۱]

لوگوں کے نظریات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاؤ پھر جو نظریہ حق وحقیقت سے نزدیک اور شک وشبہ سے دور ہو اسے اپناؤ۔

فقہ مقارن کی پہلی کرن امام سجاد (ع) کے اس قول میں نظر آتی ہے جو آپؑ نے اہل سنت کے مشہور عالم و مجتہد زہری کو اس کے سوال کے جواب میں عنایت فرمایا آپؑ اس تفصیلی جواب میں دو مسئلہ میں تطبیقی اور مقارن گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> **'' ما صوم المریض و صوم المسافر فانّ العامة اختلف فیه فقال بعضهم: یصوم و قا ل قوم منهم لایصوم و قال قول منهم: ان شاء صام و ان شاء افطر. اما نحن فنقول : یفطر فی الحالین جمیعا فان صام فی السفر و المرض فعلیه القضاء قال الله تعالی عز و جل : (فعدة من ایام اخر)** [۲۲]

مسافر اور مریض کے روزے کے بارے میں عامہ میں اختلاف ہے بعض کا کہنا ہے روزہ رکھے گا بعض کہتے ہیں: نہیں رکھے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اگر رکھنا چاہتا ہے تو روزہ رکھ سکتا ہے

اگر نہیں چاہتا تو نہ رکھے، لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں حالت میں انسان روزہ نہیں رکھ سکتا اور اگر مرض یا سفر کی حالت میں روزہ رہا تو اس کی قضا کرنی ہوگی خداوند عالم ارشاد فرمارہا ہے کہ **فعدة من ایام اخر** اور دنوں میں اس کی قضا کرے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام کی علمی مرجعیت سے منصور دوانقی کو بہت زیادہ تشویش تھی اور ابوحنیفہ سے کہتا ہے کہ لوگ جعفر بن محمد کے دیوانے ہورہے ہیں لہٰذا تم دونوں کا ایک مناظرہ ہونا چاہیئے، مناظرہ کی محفل سجی ابو حنیفہ نے چالیس مشکل سوال امامؑ سے پوچھے ہر سوال کے جواب میں امامؑ فرماتے تھے: ''**انتم تقولون کذا و اهل المدینة یقولون کذا ونحن (اهل بیت)نقول کذا و کذا** ''تم لوگ اس مسئلہ کو اس طرح بیان کرتے ہو، اہل مدینہ اس طرح بیان کرتے ہیں اور ہم (اہل بیتؑ) اس طرح بیان کرتے ہیں، جب امامؑ نے ابوحنیفہ کے سارے سوالوں کا اچھی طرح جواب دے دیا تو ابوحنیفہ نے کہا:

'' **انّ اعلم الناس اعلمهم بآرائهم ...** '' ۲۳

''لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والا وہی ہے جو ان کے نظریات کو زیادہ جانتا ہے''، اہل بیت علیہم السلام کے بعد ان کے اصحاب اور شاگردوں نے فقہ مقارن کا سلسلہ جاری رکھا اور مناظروں میں مختلف فقہی نظریات بیان کر کے اپنے مذہب کا دفاع کرتے تھے اور کبھی کبھی اس سلسلہ میں کتابیں بھی لکھتے تھے۔

دوسرا مرحلہ: تدوین کا دور

اس دور میں شیعوں میں فقہ مقارن کی تدوین ہوئی اور پہلی بار شیخ مفیدؒ متوفا ۴۱۳ھ نے اپنے شاگرد سید مرتضی کے کہنے پر ((الاعلام)) نامی کتاب لکھی انھوں نے اس کتاب میں ان فقہی احکام کو جمع کیا ہے جنھیں شیعہ متفقہ طور سے قبول کرتے ہیں اور اہل سنت متفقہ طور سے انکار کرتے ہیں اس کتاب کے تحریر کرنے کا مقصد دو فقہی مکتب (شیعہ وسنی) میں فقہی مباحث کے حدود سے واقفیت تھی۔

اس کے بعد سید مرتضی متوفا ۴۳۶ھ نے کتاب ''الانتصار'' تحریر کی، موصوف نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شیعوں کے بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں جن میں اہل سنت کے بعض مذاہب ان کے ہم عقیدہ ہیں، اس لئے شیعہ اجماع کے خلاف نہیں ہیں اور بعض موارد میں شیعوں کے ذاتی نظریات بھی ہیں۔ سید مرتضیؒ نے فقہ مقارن کے علاوہ اس کے طریقہ کار کو بھی بیان کیا ہے انھیں یہ معلوم تھا کہ فقہ مقارن بھی علم فقہ کی طرح

و کیفیة الاستدلال علیهم " رکھا،اس رسالہ میں فقہ مقارن کی بحث کرنے، استدلال کرنے اوردفاع کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان کے بعد ابن زہرہ نے اسی سلسلہ کو جاری رکھا وہ مختلف مذاہب کی فکر کا جائزہ لینے کو اصول فقہ کے فائدوں میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" علی انّ لنا فی الکلام فی اصول الفقه غرضا آخر سوی ما ذکرناه و هو بیان فساد کثیر من مذاهب مخالفینا فیها و کثیر من طریقهم الی تصحیح ما هو صحیح منها و ذالک یخرجهم عن العلم بشیء من فروع الفقه لانّ العلم بالفرع من دون العلم بأصله محال و هذا غرض کبیر یدعواالی العنایة باصول الفقه و یبعث علی الاشتغال بها "

مذکورہ مقصد سے ہٹ کر اصول فقہ کا ایک اور مقصد بھی ہے وہ یہ کہ ان مباحث میں ہمارے مخالف بہت سے نظریات غلط ہیں اوران کی بہت سی راہ وروش میں تصحیح کی ضرورت ہے تا کہ صحیح کو غیر صحیح سے امتیاز دیا جا سکے اور تنقید وتحقیق کا یہ طریقہ فقہی مسائل میں ان کے اطمینان کوختم کر دے گا،اس لئے کہ اصل کے بغیر فرعی مسائل کا علم محال ہےاور یہی وہ بڑا مقصد ہے جو اصول فقہ سیکھنے اوراس کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

سید مرتضیٰؒ کے بعد شیخ طوسیؒ متوفا ۴۶۰ھ نے فقہ مقارن کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اوراس سلسلہ میں کتاب ''الخلاف''، تحریر کی،اس کتاب میں انھوں نے گزشتہ سبھی فقہا کے ان تمام مسائل پر بحث کی ہے جن میں شیعہ ان سے اختلاف رکھتے ہیں اور محکم وقوی دلیلوں کے ذریعہ شیعوں کے نظریات کوثبات اوراستحکام بخشا ہے،موصوف نے فقہ کے مروجہ بحث کے طریقہ پرتمام فقہی ابواب اور ہر مذہب کے نظریات کوان کے اندرونی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تیسرا مرحلہ: تکمیلی دور

علامہ حلیؒ متوفا ۷۲۶ھ کے زمانہ میں فقہ مقارن کا ایک نیا دورشروع ہوا،انھوں نے ''تذکرۃ الفقہاء'' نامی

کتاب لکھی جس میں مختلف مذاہب کے نظریات کی وضاحت اور مذہب شیعہ کو ترجیح دینے کے علاوہ جزئی احکام وغیرہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور یہ چیز گزشتہ کتابوں میں نہیں پائی جاتی۔ موصوف نے ''منتہی المطالب'' نامی اپنی دوسری کتاب میں تطبیقی روش پر احکام فقہی کا جائزہ لیا ہے۔

شہید اوّل نے کربلائے معلی میں سید عمید الدین ابن ابی الفوارس سے کتاب ''تذکرۃ الفقہاء'' پڑھی اس طرح شیعی حوزۂ علمیہ میں فقہ مقارن کی تدریس بھی شروع ہوگئی۔۲۴

شہید اوّل نے بھی علامہ کی روش جاری رکھی اور کتاب ''القواعد والفوائد'' میں تطبیقی طرز پر فقہی، اصولی اور ادبی قواعد بیان کئے ہیں، حقیقت میں یہ دور شیعوں میں فقہ مقارن کی معراج کا دور شمار ہوتا ہے۔

چوتھا مرحلہ: تنزلی اور افول کا دور

علامہ کے بعد ان کے بعض شاگردوں نے دوسرے مذاہب کے اقوال ونظریات کو اپنی کتابوں میں لکھنے سے اجتناب کیا اس سلسلہ میں ابو محمد بن ابی طالب یوسفی آبی صاحب کتاب ''کشف الرموز'' وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس روش سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنی کتاب میں اہل سنت کے اقوال اور فقہی استدلال لکھنے سے گریز کیا ہے۔

علامہ کے شاگردوں خاص کر فخر المحققین نے بھی یہی روش اختیار کی اور سنی اقوال واستدلال تحریر کرنے کے بجائے فقہائے شیعہ کے اقوال، افکار اور استدلال پر اکتفاء کی۔۲۵

اس کے بعد ملا امین استرآبادی کی رہبری میں اخباریوں کے حملوں کے سبب تطبیقی طرز فکر میں کمی ہوتی رہی اس لئے کہ اخباریوں کا عقیدہ ہے کہ ہر مسئلہ میں فقط احادیث اہلبیتؑ کی طرف رجوع کیا جائے اور وہ علامہ پر اعتراض کرتے تھے کہ بلاوجہ اہل سنت سے مطالب نقل کرتے ہیں جبکہ شیعی اصول اور اہلبیتؑ کی روایات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بہرحال اس دور میں فقہ مقارن کی تنزلی اور زوال کے کم از کم حسب ذیل تین سبب ہیں:

۱۔ تطبیقی مباحث کو محور بنانا اور خالص شیعی فقہ کو تحت الشعاع قرار دینا۔

۲۔ شیعہ مذہب میں دوسرے مذاہب کے مسائل وعناصر آجانے کے سبب بدبینی کا پیدا ہونا۔

۳۔علمائے اصول کے شیوہ اورروش پر اخباریوں کے شدید اعتراضات۔

پانچواں مرحلہ: جدید دور

اس دور میں آیت اللہ بروجردیؒ نے فقہ مقارن کو ایک نیا رخ دیا، ان کا کہنا تھا کہ اہل بیتؑ کی صحیح حدیثوں کا پتہ لگانے کے لئے اہل سنت کی فقہ اورروایتوں پر پوری نظر ہونی چاہیئے اس لئے کہ شیعی فقہ، اہل سنت کی فقہ پر ناظر ہے جب بھی اہل بیتؑ کا نظریہ اہل سنت کی فقہ سے مختلف ہوتا تھا تو وہ حضرات اپنا نظریہ بیان کرتے تھے ورنہ اس کی مخالفت نہیں کرتے تھے۔

موصوف کے بعض شاگردوں نے بھی یہی روش اختیار کی اور درس خارج کہتے وقت اہل سنت کے اقوال ونظریات بیان کرتے تھے البتہ حال ہی میں شیعہ اورسنی اختلافی فقہی مسائل پر تطبیقی اور مقارنی کتابیں لکھی گئی ہیں مثال کے طور پر مرحوم شرف الدین موسوی نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ''المسائل الفقہیہ'' رکھا اسی طرح اس دور میں مندرجہ ذیل کتابیں بھی اسی موضوع پر لکھی گئیں۔

۱۔ **الفقه علی المذاهب الخمسة ، محمد جواد مغنية**

۲۔ **الاعتصام بالکتاب و السنة جعفر سبحانی**

۳۔ **در اسات فقهية فی مسائل خلافة ، نجم الدين طبسی**

۴۔ **الفقه علی مذاهب الاربعة و مذهب اهل البيت (ع) سيد محمد غروی و یاسر مازح**

آخر میں آیت اللہ جناتی نے فقہ مقارن پر ''دروس فی الفقہ المقارن'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر فقہی میدان میں تطبیقی مباحث پر چار چاند لگا دیا۔

۹۔تطبیق کا طریقہ اوراصول

کسی بھی بحث میں پڑنے سے پہلے اس کے طریقہ اوراصول سے واقفیت ضروری ہے اس لئے کہ ہر علمی مسئلہ کے دورخ ہوتے ہیں ایک معنی ومطلب دوسرے تحقیق کا طریقہ واصول لہٰذا فقہ مقارن بھی اس قاعدہ سے باہر نہیں ہے ذیل میں بعض اصول اورطریقہ کو بیان کیا جارہا ہے۔

الف۔ طرفداری اور تعصب سے پرہیز

فقہ مقارن کے بارے میں تحقیق کرنے والے کو چاہیئے کہ اپنے مذہب کی طرفداری سے پرہیز کرتے ہوئے خود کو حقیقت و دلیل کا تابع قرار دے اس لئے کہ تعصب کی صورت میں حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا اور محکم دلیلوں کے سامنے خود کو تسلیم نہیں کرسکتا۔

ب۔ ہر مذہب کے نظریات اور معتبر منابع سے واقفیت

کسی خاص مذہب کا فقیہ دوسرے مذہب کے منابع ، روش اور افکار سے بہت ہی کم آشنا ہوتا ہے، لہٰذا تطبیقی بحث کے لئے ہر مذہب کے اصلی و معتبر منابع سے واقفیت ہونی چاہیئے تاکہ کسی قول کو کسی طرف منسوب کرتے وقت کوئی بھی شک وشبہ باقی نہ رہ سکے؛ یہ بھی پیش نظر ہونا چاہیئے کہ کبھی کبھی ایک ہی مذہب میں چند نظریئے پائے جاتے ہیں اور فقہ مقارن کی بحث کرنے والے بعض افراد کسی ایک نظریہ کا مطالعہ کرکے اس کے کو سارے اہل سنت یا سارے شیعوں سے منسوب کرنے لگتے ہیں جبکہ انھیں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

ج۔ فقہ مقارن کے اصول و مقدمات سے واقفیت

فقہ مقارن کے کچھ اصول ہیں جن کا علم ہونا فقہ مقارن پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے ہر مذہب کے اصول فقہ، قواعد جرح و تعدیل، علم درایہ، علم رجال، جرح و تعدیل کے معیار وہ امور ہیں جس کی بنیاد پر ہر مذہب اپنا فقہی نظریہ انتخاب کرتا ہے لہٰذا فقہ مقارن کے ایک محقق کو ان امور کا علم ہونا ضروری ہے۔

د۔ ہر مذہب میں رائج اصطلاحات کا علم

ہر مذہب اپنے بعض مباحث میں ایک مخصوص اصطلاح استعمال کرتا ہے فقہ تطبیقی و مقارن پر تسلط کے لئے ان اصطلاحات کا اچھی طرح علم ہونا ضروری ہے مثال کے طور پر ''شرط الشیخین'' ''صاحبین''، وغیرہ کبھی کبھی بعض اصطلاحات کے دو مذہب میں دو مختلف اور متضاد معنی ہوتے ہیں ایسے میں جس محقق کو دونوں معنوں کا علم نہیں ہوتا وہ ایک مطلب کو غلط سمجھ بیٹھا ہے۔[۲۶]

۱۰۔ کتابوں کا تعارف

تاریخ میں فقہ مقارن پر بہت سی گرانقدر کتابیں لکھی گئی ہیں ذیل میں چند کتابوں کے نام پیش کئے

جارہے ہیں:

الف: فقہ مقارن پر شیعی کتابیں:

۱۔ الاعلام فیما اتفقت علیہ الامامیہ من الاحکام مما اتفقت العامۃ علی خلافہم فیہ، شیخ مفید(متوفائے ۴۱۳ھ)؛

۲۔ الانتصار، علی بن الحسین، سید مرتضی علم الہدی، (متوفائے ۴۳۶ھ)؛

۳۔ الخلاف، شیخ طوسی، (متوفائے ۴۶۰ھ)؛

۴۔ تذکرۃ الفقہاء، حسن بن یوسف بن مطہر حلّی، (متوفائے ۷۲۶ھ)؛

۵۔ منتھی المطالب فی تحقیق المذاہب، حسن بن یوسف بن مطہر حلّی، (متوفائے ۷۲۶ھ)؛

۶۔ الفقہ علی المذاہب الخمسہ، محمد جواد مغنیہ؛

۷۔ دروس فی الفقہ المقارن، محمد ابراہیم جناتی (معاصر)؛

۸۔ المسائل الفقہیہ، شرف الدین موسوی؛

۹۔ الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جعفر سبحانی (معاصر)؛

۱۰۔ دراسات فقہیہ فی مسایل خلافیہ، نجم الدین طبسی (معاصر)؛

۱۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ومذہب اہل البیت (ع) سید محمد غروی و یاسر مازح (معاصر)؛

ب: فقہ مقارن پر اہل سنت کی کتابیں:

۱۔ اختلاف الفقہاء، ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفائے ۳۱۰ھ)؛

۲۔ اختلاف الفقہاء، ابو جعفر طحاوی، (متوفائے ۳۲۱ھ)؛

۳۔ التجرید، قدوری حنفی (متوفائے ۴۲۸ھ)؛

۴۔ تاسیس النظر، ابو زید دبوسی (متوفائے ۴۳۰ھ)؛

۵۔ الخلافیات، بیہقی شافعی (متوفائے ۴۵۸ھ)؛

۶۔ الافصاح عن معانی الصحاح، یحیی بن محمد بن ہبیرہ الدوری (متوفائے ۵۶۰ھ)؛

۷۔الوسائل فی فروق المسائل، ابن جماعۃ شافعی (متوفائے ۴۸۰ھ)؛

۸۔مختصر الکفایۃ، عبدری شافعی (متوفائے ۴۹۳ھ)؛

۹۔تحفۃ الفقہاء، علاءالدین سمرقندی (متوفائے ۵۳۹ھ)؛

۱۰۔الردّ علی سیر الاوزاعی، ابو یوسف (متوفائے ۱۸۲ھ)؛

(۱۱) الحجۃ علی اہل المدینہ، ابو عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی (متوفائے ۱۸۹ھ)؛

(۱۲) المجموع شرح المہذب، نووی شافعی (متوفائے ۶۷۶ھ)؛

(۱۳) حلیۃ العلماء فی اختلاف الفقہاء، ابو بکر محمد بن احمد شاشی شافعی (متوفائے ۵۰۷ھ)؛

(۱۴) الطریقۃ الرضویہ، رضی الدین السرخسی (متوفائے ۵۴۴ھ)؛

(۱۵) مختلف الروایۃ، علاءالدین محمد بن عبدالحمید حنفی (متوفائے ۵۵۴ھ)؛

(۱۶) الاشراف علی مذاہب الاشراف، ابن ہبیرۃ الحنبلی (متوفائے ۵۶۰ھ یا ۵۵۵ھ)؛

(۱۷) تقویم النظر، الدہان الشافعی (متوفائے ۵۸۹ھ)؛

(۱۸) المنظومۃ، نسفی حنفی (متوفائے ۵۳۷ھ)؛

(۱۹) الذخیرۃ، احمد بن ادریس قرافی (متوفائے ۶۸۲ھ)؛

(۲۰) رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ، ابو عبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن دمشقی شافعی (آٹھویں صدی)؛

(۲۱) البحر الذخار الجامع لمذاہب علماء الامصار، احمد بن یحیی بن مرتضی (متوفائے ۸۴۰ھ)؛

(۲۲) السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازہار، محمد بن علی بن محمد شوکانی (متوفائے ۱۲۵۰ھ)؛

(۲۳) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، عبدالرحمٰن الجزیری (متوفائے ۱۳۶۰ھ)؛

(۲۴) الفقہ الاسلامی وادلتہ، وہبۃ الزحیلی (معاصر)؛

(۲۵) الفقہ المقارن، حسن احمد الخطیب (معاصر)؛

(۲۶) اختلاف الفقہاء والقضایا المتعلقہ بہ فی الفقہ الاسلامی المقارن، (احمد محمد الحصری (معاصر)؛

(۲۷) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابن رشد (متوفائے ۵۹۵ھ)؛

(۲۸) المحلی، علی بن احمد بن حزم (متوفائے ۴۵۶ھ)؛

(۲۹) طریقۃ الخلاف بین الاسلاف، علاء الدین محمد بن عبد الحمید سمرقندی (متوفائے ۵۵۲ھ)؛

(۳۰) موسوعۃ الفقہ الاسلامی، مجلس الاعلی۔

حوالے

الف۔ مصباح المنیر ، احمد، احمد بن محمد بن علی، فیوصی، ج ۱/ص ۱۷۹

۱۔ معجم مفردات الفاظ قرآن، حسین بن محمد، راغب اصفہانی، ص ۱۵۷، میمنہ، قاہرہ۔

۲۔ مصباح المنیر ، احمد بن محمد بن علی، فیومی، ج ۲ ص ۵۰۰، مصر۔

۳۔ معجم مفردات الفاظ قرآن، ص ۴۱۶/ ۴۱۷۔

۴۔ معالم الدین وملاذ المجتہدین، حسن بن زین الدین عاملی، ص ۲۶، مکتبۃ الداوری قم۔

(۵) الاصول العامۃ للفقہ المقارن، سید محمد تقی حکیم، ص ۱۳۔

(۶) الفقہ المقارن، حسن احمد الخطیب، ص ۵۰۔

(۷) مقدمۃ فی دراسۃ الفقہ الاسلامی، محمد، الدسوقی، ص ۲۳۶۔

(۸) الاصول العامۃ للفقہ المقارن، ص ۱۵۔

(۹) مقدمۃ فی دراسۃ الفقہ الاسلامی، ص ۲۲۹/ ۲۳۰۔

(۱۰) الاصول العامۃ للفقہ المقارن، ص ۱۴۔

(۱۱) الفقہ المقارن، ص ۵۱/ ۵۲۔

(۱۲) المجموع شرح المہذب، ابوذکریا، محیی الدین بن شرف، ج ۱، ص ۵، دار الفکر، بیروت۔

(۱۳) اسباب اختلاف الفقہاء فی الاحکام الشرعیہ، ص ۸۰۔

(۱۴) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، محمد بن رشد قرطبی، ج ۱ ص ۵/ ۶، دار المعرفۃ، بیروت۔

(۱۵) الفقہ المقارن، ص ۱۰۳۔

(۱۶) الفقہ المقارن، ص ۱۲۴۔

(۱۷)طریقۃ الخلاف بین الاسلاف،ص/۲۲۔

(۱۸)مقدمہ ٔابن خلدون، عبدالرحمٰن، ص۳۶۲،دارالفکر، بیروت۔

(۱۹) تاریخ الفقہ واصولہ، ص۱۲۵۔

(۲۰) نہج البلاغہ، شریف رضی، صبحی صالح، بیروت۔

(۲۱)من لایحضرہ الفقیہ، محمد بن علی بن الحسین، صدوق، ج۴،ص۳۸۵،دارالکتب الاسلامیہ، تہران۔

(۲۲) تاریخ دمشق، (ترجمہ امام زین لعابدین علی بن الحسینؑ)، ص/۲۸۔۲۹؛ فرائد السبطین، ابراہیم بن محمد، ج/۲، ص/ ۲۳۳، بیروت؛ البدایۃ والنہایۃ، اسماعیل بن کثیر، دمشق، ج/۹، ص/۱۱۵، بیروت۔

(۲۳)الکامل فی التاریخ، ج۵،ص۱۸۔

(۲۴)بحارالانوار، محمد باقر مجلسیؒ، ج۱۰۴، ص۱۱۷، داراحیاء التراث العربی۔

(۲۵)مقدمہ ای برفقہ شیعہ، حسین مدرسی، طباطبائی، ص۵۴۔

(۲۶)اصول الحدیث واحکامہ، جعفر سبحانی، ص۶۶۔۶۷، موسسۃ الامام الصادق (ع)۔

اتحاد کے علمبردار

سید محسن بن عبدالکریم امین عاملی شقراوی

ترجمہ: سید اظہر زیدی

ماخوذ از اندیشہ تقریب شمارہ ۷

اشاریہ

اسلام کی طاقت وحدت و اتحاد میں مضمر ہے۔ امت مسلمہ کی اصلاح کی کوشش اور اس راہ میں کٹھن منزلیں طے کرنے والے علماء کا تعارف اس اہم مقصد کے حصول میں نمایاں کردار ادا کرسکتا ہے۔ آج دشمن کی ثقافتی اور نظریاتی یلغار کی وجہ سے اسلام ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ ماضی میں بھی نالائق حکمرانوں کی پالیسیوں اور فرقہ واریت کو ہوا دینے کی وجہ سے ہم اسلام کے بہت سے قیمتی اور انمول آثار سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ایک طویل عرصہ تک اپنی فکری اور فنی صلاحیتوں کو بے بنیاد فرقہ وارانہ اختلافات کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔

لاثانی برتری اور انمول تعلیمات کے باوجود اسلام کو کبھی یہ موقعہ نہیں ملا کہ وہ اپنی آرزوؤں کو مسلمانوں کے درمیان عملی جامہ پہنائے۔ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ اسلام کی جانب حقیقت پسندانہ اور مفادات سے دور نگاہ ڈالی جائے اور صدر اسلام کے خلوص اور ایمان کو نمونہ عمل اور اسلامی فرقوں کے مشترکات کو بنیاد بنا کر آگے بڑھیں۔ شاید اس طرح ایک متحد، طاقتور اور مضبوط اسلام ابھر کر سامنے آئے۔

اس عظیم ہدف کو مختلف طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی ممالک کے

دانشوروں اور علماء کا تعارف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔لہذا آئندہ مباحث میں عالم اسلام کی دو اہم شخصیات کا تعارف پیش کریں گے جنھوں نے اسلامی مذاہب کو قریب کرنے، لوگوں کو وحدت و اتحاد کی دعوت دینے اور امت مسلمہ کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔

اسوہ وحدت ونمونہ استقامت

سید محسن بن عبدالکریم امین عاملی شقراوی (۱۷۳۱ھ-۴۸۲۱ھ)/(۲۵۹۱-۶۶۸۱)

آل امین کا نسب

سید محسن بن سید عبدالکریم کا نسب سید علی بن سید محمد امین بن سید موسی بن سید حیدر بن سید ابرہیم کے راستے اسلام کے زندہ و جاوید شہید حضرت زید بن علی بن الحسین زین العابدین کے فرزند حضرت حسین ذی الدمعہ (۱۹۱ھ) تک پہنچتا ہے۔بعض موثق قرائن وشواہد کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ سادات جبل عامل کا نسب عبداللہ محض بن حسن مثنی بن حسن بن علی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔اسی وجہ سے امین عاملی کو کبھی "حسینی" اور کبھی "حسنی" کہا گیا ہے۔

سید محسن امین عاملی کے اجداد گرامی عراق کے شیعہ نشین شہر حلہ میں سکونت پذیر تھے یہاں تک کہ آپ کے اجداد میں سے ایک عظیم ہستی (شاید سید حیدر) کو جبل عامل کے مومنین کی جانب سے لبنان آنے کی دعوت دی گئی تو آپ نے حلہ سے جبل عامل کی جانب رخت سفر باندھا اور جبل عامل کے ایک قریہ شقراء میں سکونت اختیار کی اور اسے اپنا وطن قرار دیا اور مرتے دم تک شقراء ہی میں قیام پذیر رہے۔ان کے مزار پر لگے ہوئے کتیبہ پر تاریخ وفات ۵۷۱۱ھ تحریر/کندہ ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مفتاح الکرامۃ جیسی عظیم کتاب کے مولف مرحوم سید جواد عاملی (۶۲۲۱ھ) سید حیدر کے پوتے ہیں۔

خاندان امین، امین کے نام سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے سے قبل "قشاقشی" یا "قشاقیشی" کے نام سے مشہور تھا۔ یہ نام کیوں شہرت رکھتا تھا۔اس سلسلہ میں کوئی خاص وجہ معلوم نہیں لیکن بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ "قشاقشی" درحقیقت لفظ "اقساسی" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔اقساس کوفہ کے نزدیک واقع ایک دیہات کے مالک کا نام تھا جہاں حضرت حسین ذی الدمعہ کی اولاد میں سے ایک بہت بڑا قبیلہ ا? باد تھا اسی لیے لوگ اس دیہات کو اقساسی کہتے تھے۔سید محسن کے اجداد گرامی میں سے ایک محمد امین کے نام سے ملقب تھے اسی لیے ان کی اولاد کو آل

امین کہا جاتا ہے۔

ولادت، خاندان اور تعلیم

سید محسن امین نے ۲۸۲۱ھ کو جبل عامل کے دیہات شقراء کے ایک انتہائی دیندار اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ اسی لیے انھیں عاملی اور شقراوی کہا جاتا ہے۔ محمد باقر نامی بیٹے کی وجہ سے سید محسن امین کی کنیت ابو محمد الباقر تھی۔ بعض سیرہ نگاروں نے سید محسن امین کی تاریخ ولادت ۴۸۲۱ھ قرار دی ہے۔ سید محسن امین عاملی نے اپنی عظیم کتاب "اعیان الشیعہ " کے آخر میں اپنی سوانح عمری تحریر کرتے ہوئے بعض ایسے قرائن وشواہد بیان کیے ہیں جن کی روشنی میں ۴۸۲۱ھ والا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سید محسن امین کے والد ماجد سید عبدالکریم متقی، پرہیزگار اور پاک طینت انسان تھے۔ دن میں روزہ رکھتے اور خوف خدا سے ہمیشہ گریہ کرتے رہتے تھے۔ خانہ خدا، بیت المقدس اور عراق کی زیارات کا شرف حاصل کرنے کے بعد ایران میں امام رضا علیہ السلام کی کی زیارت کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ چچازاد بھائی سید کاظم امین نے انھیں مشورہ دیا کہ مزید سفر کرنے کے بجائے اپنے سفر کے اخراجات دینی طلاب کی فلاح و بہبود پر صرف کریں۔ سید عبد الکریم کو یہ بات بہت پسند آئی اور انھوں نے ایران جانے کا ارادہ ترک کیا اور جبل عامل واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ جبل عامل میں قیام کرنے کے بعد پورے خاندان کے ساتھ عراق تشریف لائے اور ۵۱۳۱ھ میں نجف میں داعی حق کی آواز پر لبیک کہا اور امام علی علیہ السلام کے حرم میں سپرد خاک ہوئے۔

سید محسن امین کی والدہ بھی انتہائی پرہیزگار، گھر گرہستی کی ماہر اور سلیقہ شعار تھیں۔ سید محسن امین کی والدہ نے ۰۰۳۱ھ میں دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کیا۔ سید محسن کے والدین اگرچہ علمی لحاظ سے بہت زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے حفظ قرآن، خطاطی، اشعار اور اس قسم کی ابتدائی تعلیم میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سید محسن امین کو جب مکتب میں داخل کروایا گیا تو استاد کے سخت رویے کی وجہ نے سید کا دل تعلیم سے اچاٹ کر دیا اور سید مکتب نے چھوڑ دیا۔ سید محسن امین کی والدہ نے کمر ہمت باندھی اور سید کو خود پڑھانا شروع کر دیا۔ سولہ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو سید محسن نے ماں کی جدائی میں انتہائی دلسوز اور دردناک اشعار کہے؛ ذیل میں بعض اشعار کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:

> "اے قبر! اے کاش جانتی کہ لباس شرافت پہنے کتنی پاک سیرت خاتون تیرے دامن میں آرام فرما ہیں۔ اپنے فرزند پر محبت و مہربانی کا سایہ کیے رکھنے والی ماں پریشان نہ ہونا تمھارا بیٹا سختیوں

سے مقابلہ کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ نیکیوں کے ذریعہ ا?پ کی آنکھیں ٹھنڈی کروں گا، آپ خوب جانتی تھیں کہ کس بیٹے کی تربیت کر رہی ہیں۔ ماں! میں تو چند لمحوں کی دوری بھی برداشت نہیں کر پاتا تھا اب محشر تک میرے اور ا?پ کے درمیاں فاصلے پڑ گئے ہیں اور رابطے منقطع ہو گئے ہیں۔

سید محسن امین اکلوتے فرزند تھے اور ان کے یہ اشعار ماں بیٹے کے درمیان حد درجہ محبت کی غمازی کر رہے ہیں۔ سید محسن امین کی والدہ مشہور دانشور اور شاعر شیخ محمد حسین فلحہ میسی کی صاحبزادی تھیں اور سید محسن امین کے شعری ذوق کا سبب بھی شاید یہی تھا۔ سید محسن امین کے دادا "سید علی امین عاملی" نجف میں ایک مشہور فقیہ کے طور پر شہرت رکھتے تھے اور سید محسن امین نے ان سے بہت زیادہ کسب فیض بھی کیا تھا۔

سات سال کی عمر میں سید محسن امین نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد کتابت، خطاطی اور علم نحو کی طرف رخ کیا۔ اجرومیہ کا متن حفظ کرنے کے بعد ابن ہشام انصاری کی کتاب قطر الندی و بل الصدی اور سعد الدین تفتازانی کی کتاب تصریف پڑھی۔ سید محسن امین نے یہ دونوں کتابیں ۵۹۲۱ ھ سے ۶۹۲۱ ھ کے دوران اپنے چچا زاد بھائی سید محمد حسین امین سے پڑھیں۔

۹۲۱۷ ھ میں مزید تعلیم کے لیے "عیثا الزط" نامی گاؤں میں واقع مدرسہ تشریف لے گئے اور سید جواد مرتضی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور شرح قطر الندی اور الفیہ ابن مالک پر لکھی گئی شرح ابن ناظم پڑھی۔ اسی دوران شافیہ ابن حاجب اور مغنی اللبیب بھی ختم کر ڈالی۔ اشعار سے لگاؤ کی وجہ سے علم صرف کے بارے میں ایک منظوم کتاب بھی تحریر فرمائی۔

علم کا شوق سید محسن امین عاملی کو "بنت جبیل" نامی قصبہ میں واقع ایک مدرسہ لے گیا جہاں عراق سے تشریف لائے ہوئے شیخ موسی شرارہ سے ملاقات کی اور ان کے حلقہ درس میں شامل ہو کر بہت زیادہ کسب فیض کیا۔ منطق، معانی و بیان، اصول اور فقہ کی تعلیم شیخ شرارہ سے حاصل کی۔ بنت جبیل کے مدرسہ کی رونق شیخ شرارہ کے دم قدم سے تھی چنانچہ ماہ شعبان ۱۳۰۴ ھ میں اس عظیم استاد کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی طلاب تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے اور مدرسہ تقریبا بند ہو گیا۔ اسی وجہ سے سید محسن اپنے گاؤں شقراء واپس تشریف لے آئے اور یہاں آ کر ابتدائی طالب علموں کو زیور تعلیم سے ا?راستہ کرنا شروع کر دیا اور خود بھی مطالعات میں مصروف رہے۔

عراق روانگی

سید محسن امین عاملی نجف اشرف جانے کے لیے ہمیشہ تڑپتے تھے لیکن مالی حالات اس سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسری طرف حصول علم کی خواہش بھی ہمیشہ بے کل کیے رکھتی تھی۔ چنانچہ سید محسن امین عاملی نے علمی پیاس بجھانے کے لیے بعلبک، صیدا، جولان سمیت لبنان کے متعدد شہروں کا سفر کیا لیکن شیخ موسی شرارہ کی وفات کے بعد کبھی بھی سید محسن امین کا لبنان میں دل نہیں لگا۔ حتی کہ لبنان کی بااثر شخصیات کی جانب سے عراق کے مختلف علماء کی لبنان ا? مد کی دعوت بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ حتی کہ سید مہدی حکیم نے لبنان ا? نے کی دعوت قبول کی اور مالی لحاظ سے مدد بھی فرمائی۔ لیکن یہ سلسلہ دیر پا ثابت نہ ہوا اور بالاخر سید محسن امین کو مزید اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے راہی نجف اشرف ہونا پڑا۔

یہ صورت حال شیخ موسی شرارہ کی وفات ۳۰۳۱ھ سے لے کر ۸۰۳۱ھ تک جاری رہی یہاں تک کہ شیخ حسین مغنیہ نامی لبنانی عالم دین نے عراق کی جانب رخت سفر باندھا تو سید محسن کو بھی ہمراہ چلنے کی دعوت دی۔ سید محسن مدت سے عراق جانے کی خواہش دل میں لیے بیٹھے تھے لیکن بینائی سے محروم ضعیف باپ کی بیماری کی وجہ سے سید فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سید محسن کے والد نے استخارہ کر کے خداوند متعال پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا۔ استخارہ بہت اچھا آیا تو سید محسن اپنی زوجہ اور شیخ حسین مغنیہ کے ہمراہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔

رمضان المبارک ۸۰۳۱ھ کے اختتام پر سید محسن اپنے ہمراہیوں کے ساتھ آبائی وطن شقراء سے روانہ ہو کر صیدا اور بیروت کے راستے اسکندرونہ کی بندرگاہ جا پہنچے۔ وہاں سے یہ مختصر قافلہ حلب کے راستے بقرعید کے دوسرے دن کاظمین اور بغداد پہنچا۔

نجف اشرف آمد

یہ سفر تین ماہ پر محیط تھا۔ سید محسن نے کاظمین پہنچ کر امام موسی کاظم علیہ السلام اور امام محمد تقی علیہ السلام کے مرقد مطہر کی زیارت کی اور پھر بغداد اور کربلا کے راستے نجف اشرف کی جانب گامزن ہوئے۔ جس دور میں سید محسن امین نجف پہنچے تھے وہ دور نجف کی علمی عظمت کا عروج تھا۔ ایران، عراق ہند، پاکستان، روس، افریقہ، سنٹرل ایشیا سمیت دنیا بھر کے شیعہ مال امام، مراجع تقلید کی خدمت میں ارسال کرتے تھے اور اسی وجہ سے مدارس آباد اور پررونق تھے۔ اس پر مزید چار چاند ایران اور دنیائے عرب کے نامور اساتذہ کی موجودگی نے لگا دیئے تھے۔ آخوند خراسانی، حاج آقا رضا ہمدانی، شیخ عبداللہ حائری مازندرانی، سید محمد کاظم یزدی، میرزا حبیب اللہ رشتی، محمد طہ نجف، شیخ علی رفیش، سید محمد طباطبائی آل بحرالعلوم، شیخ عباس علی، شیخ عباس حسن آل کاشف الغطاء اور سید حسین قزوینی الاصل

جیسے اساتذہ میں سے ہر ایک فقہ واصول کی تعلیم کے لیے جداگانہ مدرسہ کا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ نجف اشرف سے باہر سامراء میں سید محمد حسن شیرازی مرجعیت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے اور کربلا میں شیخ زین العابدین مازندرانی، کاظمین میں شیخ اسد اللہ تستری کے پوتے شیخ محمد تقی، سید اسماعیل صدر، سید حسن صدر اور دیگر بزرگ شخصیات عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی تھیں۔

نجف اشرف میں تعلیم

علم و دانش کے مرکز میں قدم رکھ کر سید محسن امین بہت زیادہ خوش تھے، نجف اشرف میں گیارہ سالہ قیام کے دوران سید نے بہت کچھ حاصل کیا۔ نجف اشرف کے طراز اول کے اساتذہ سے سطحیات میں فقہ واصول کی کتب شرح لمعہ، قوانین، رسائل و مکاسب پڑھیں اور درس خارج کے دروس میں مشغول ہوگئے۔ سید محسن نے شرح لمعہ اپنے چچازاد بھائی سید علی سے پڑھی، قوانین کا درس شیخ محمد باقر نجم آبادی سے حاصل کیا، ملا فتح اللہ اصفہانی المعروف شیخ الشریعہ سے رسائل پڑھی اور درس خارج کے لیے شیخ آقا رضا ہمدانی اور شیخ محمد طہ نجفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے سامراء میں مقیم میرزا محمد حسن شیرازی کے فقہی دروس میں بھی شمولیت کرتے رہے۔ اصول فقہ میں درس خارج کا مکمل دورہ کفای
الاصول کے مصنف ملا محمد کاظم خراسانی کے حضور سے پڑھا۔ کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد سید محسن امین کا شمار نجف اشرف کے نظریہ پرداز علماء اور دانشوروں میں ہونے لگا۔ سید نے درس دینا شروع کیا تو تشنگان علم کا ایک بڑا حلقہ سید کے گرد اکٹھا ہوگیا۔

شام میں سید امین کی شہرت

حوزہ علمیہ نجف میں سید محسن امین اہل تشیع کی قابل فخر شخصیت بن کر ابھرے اور ان کی شہرت نجف اشرف سے باہر بھی پھیل گئی۔ خاص طور پر اس وقت جب سید نے باقاعدہ تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور بہت سے شاگرد حلقہ درس میں شرکت کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ شاگرد، استاد کے بہترین مبلغ ہوتے ہیں اسی لیے سید محسن امین کی شہرت عراق کے علاوہ جبل عامل اور دمشق میں بھی پھیل گئی۔ جبل عامل اور دمشق کے شیعوں نے ایک اجتماعی مراسلے میں سید محسن امین سے تقاضا کیا کہ وہ دمشق تشریف لاکر علاقہ کی مذہبی سرپرستی فرمائیں۔ سید محسن امین نے دعوت قبول فرمائی اور نجف اشرف میں ساڑھے دس سال قیام کے بعد ۵۳ سال کی عمر میں نجف اشرف کو خدا حافظ کہہ کر راہی شام ہوگئے۔

سید محسن امین کی پچاس سال سے کچھ زیادہ عملی زندگی ان کے دوسرے وطن یعنی دمشق میں گزری۔ سید محسن امین نے شام کے شیعوں کو مختلف مشکلات میں گھرے ہوئے پایا۔ ان مشکلات میں سب سے زیادہ اہم مشکل جہالت، سیاسی واجتماعی پسماندگی، معاشی وتہذیبی ابتری، مذہبی وقبائلی اختلافات اور سب سے بڑھ کر مذہب کے نام پر خرافات کی بھرمار تھی۔ مجالس خوان طبقہ امام بارگاہوں اور مذہبی مقامات پر جھوٹی احادیث بیان کرتا اور لوگ ایام محرم میں دیوانوں کی طرح سر وسینہ پیٹتے، زنجیر اور کڑیاں پہنتے، بدن پر مٹی ملتے اور بعض تو تلواروں اور قمہ کے ذریعہ سر کو زخمی کر کے خون جاری کرتے۔ یہ تمام خلاف شریعت اعمال غیروں کی جانب سے استہزاء اور شماتت کا باعث تھے۔ ان تمام مصیبتوں کی بنیاد جہالت اور بدتہذیبی تھی اسی لیے سید محسن امین نے جدید طرز اور صحیح نصاب کے حامل اسکولز کی داغ بیل ڈالی اور لڑکیوں کے لیے صحیح نصاب پر مشتمل اسکول بنانے کا تہیہ کیا۔

خرافات اور تہذیبی ابتری کا مقابلہ

سید محسن امین نے سب سے پہلے اقدام کے طور پر دمشق کے تاجروں اور ثروت مند افراد کو اکٹھا کیا اور اس اہم مسئلہ کی جانب توجہ دلائی اور ایک کمپنی کی بنیاد رکھی۔ مختلف مقامات پر بلڈنگز خرید کر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے محسنیہ اور علویہ نام کے ہائی اسکول بنائے۔ علامہ سید محسن امین خود بھی بعض اوقات ان اسکولز میں تشریف لے جا کر پڑھاتے اور نزدیک سے اسکولز کی سرگرمیوں اور بچوں کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا جائزہ لیتے تھے۔ سید محسن امین نے مذہبی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ فرمائی اور اصول عقائد، احکام شرعیہ، عبادات، معاملات، وراثت، حدود، دیات، تفسیر اور اخلاق پر مشتمل ۹ نصابی کتابیں تالیف فرمائیں جو متعدد مرتبہ زیور طبع سے ا؟ راستہ ہو کر منظر عام پرا؟ چکی ہیں۔ یہ نصابی کتب محسنیہ اور علویہ اسکولز کے علاوہ لبنان اور شام کے تمام ہائی اسکولوں میں پڑھائی جانے لگیں اور فارسی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں۔

خرافات اور عزاداری کی رسومات کی اصلاح کے سلسلہ میں سید محسن امین کی راہ میں بہت سے رکاوٹیں حائل تھیں۔ شام اور عراق میں سید محسن امین کے مخالفین ناروا تہمتیں لگا کر عوام کو سید کے خلاف بھڑکاتے، منبر، مجلس اور اخبارت وجراید میں سید پر طعن تشنیع کرتے اور بعض اوقات تو کافر وزندیق کی تہمت لگانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ سید اپنے جہاد میں پوری صداقت اور سنجیدگی کے ساتھ مگن رہے اور جہالت وخرافات کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی توجہ سید کی طرف مبذول ہونا شروع ہوگئی اور جاہل اہل منبر کے گرد سے لوگ کائی کی طرح چھٹ گئے۔

سید محسن نے اسی سلسلہ میں مقاتل اور مناقب کی متعدد کتب تحریر کیں جن میں سے ایک نام لواعج الاشجان ہے جس میں واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں صحیح روایات درج کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک اور کتاب المجالس السنیہ ہے۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ چار حصے سیرت امام حسین علیہ السلام اور پانواں حصہ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ، سیدہ فاطمہ الزہرا اور دیگر ائمہ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں شائع ہونے کے بعد شام اور لبنان کے تعلیم یافتہ اہل منبر کی جانب سے بہت پسند کی گئیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔ سید محسن امین نے کتب کی اشاعت کے بعد انتہائی جرائت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے عزاداری کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل فتوی صادر کیا:

" امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کے دوران قمہ اور تلوار سے سر زخمی کرنا، کفن پہننا، طبل پیٹنا، شیپور بجانا اور اس قسم کے دیگر کام انجام دینا حرام ہیں۔ شریعت کے صریح حکم اور عقل کی روشنی میں یہ جسمانی تکلیف کسی قسم کے دینی یا دنیاوی فائدے پر مشتمل نہیں ہے۔ علاوہ بریں دیگر اقوام اہل بیت کے شیعوں کو ایک وحشی قوم کے عنوان سے تعارف کرواتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے کاموں میں نہ خدا کی رضا شامل ہے اور نہ ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ راضی ہیں۔ یہ سب شیطانی عمل ہے"

سید محسن امین کی مخالفت

سید محسن امین کی اصلاحی تحریک کے خلاف کچھ لوگوں نے قیام کیا اور عوام میں یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ سید عزاداری امام حسین علیہ السلام کو حرام سمجھتے ہیں اور بعض نے تو سید کو دین سے خارج قرار دے دیا۔ بعض عمامہ پوش حضرات نے جو سید کے اصلاحی نظریات سے نابلد تھے عوام کی مخالفت کو بنیاد بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ "سید امین نے دمشق میں ایک نیا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ابھی آہستہ آہستہ عزاداروں کو عزاداری سے روک رہے ہیں۔ ابتدائے کار ہے اس لیے احتیاط سے قدم اٹھا رہے ہیں۔ ممکن ہے کل کو دین اسلام ہی سے خارج ہو جائیں"

سید محسن امین کے مخالفوں نے جن کا مرکز نجف اشرف تھا اہل منبر کو سید محسن کے نظریات کے تقاریر کرنے پر اکسایا۔ اہل منبر کی صف میں ایک اہم اور مشہور خطیب سید صالح حلی تھے جو قوت بیان اور شجاعت میں لاثانی تھے۔ سید صالح نے اپنی تقاریر میں لوگوں کو دو گروہ میں تقسیم کیا، ایک کا نام علوی رکھا اور دوسرے گروہ کو اموی نام دیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ سید امین اور ان کے ہمنوا اموی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید صالح نے لوگوں سے کہا کہ ان لوگوں سے درنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ مٹھی بھر لوگ جاہ طلب اور اپنے مقام کی حفاظت میں سرگرداں ہیں۔

سید صالح کی عوام پسند تقاریر نے اپنا رنگ دکھایا اور لوگ سید امین اور ان کے ساتھیوں کو برا بھلا کہتے اور انھیں بنی امیہ کی صف میں شمار کرتے تھے۔ سید صالح اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ جب سید ابوالحسن اصفہانی نے قمہ زنی کے خلاف فتوی دیا تو یہ ان کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے اس اقدام کی وجہ سے علماء اور طلاب کے دو گروہوں کے درمیان حائل خلیج مزید گہری ہوگئی۔ ایک طرف لبنان میں شیخ عبدالحسین صادق اور سید عبدالحسین شرف الدین جیسے دانشور علماء نے سید محسن امین اور سید ابوالحسن اصفہانی کے فتوی کی مخالفت کی تو نجف اشرف میں مقیم جبل عامل کے طلاب نے بھی سید محسن امین کی مخالفت تیز کردی اور دوسری طرف بصرہ میں مقیم عالم دین سید مہدی قزوینی، بغداد سے سید ہبۃ الدین شہرستانی اور نجف سے استاد جعفر الخلیلی جیسے بزرگ علماء نے سید محسن امین کی اصلاحی تحریک کا دفاع کرتے ہوئے اور آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کے فتوی کی تائید میں قمہ زنی اور کفن پوشی کی حرمت کا حکم صادر کردیا۔ اس سلسلہ میں اٹھنے والے فتنہ کو خاموش کرنے کے لیے شیخ عبدالکریم جزائری، شیخ علی قمی شیخ جعفر بدیری جیسے بزرگ مجتہدین نے سید محسن امین کے نظریات کا مخالف ہونے کے باوجود خاموشی اختیار فرمائی۔

نجف اشرف اور دیگر شہروں میں سید محسن امین کی اصلاحی تحریک کی مخالفت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی اور زنجیر زنی وقمہ زنی کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ تمام خبریں سید محسن امین تک پہنچ رہی تھیں۔ علامہ سید محسن امین کے قریبی ساتھی استاد جعفر الخلیلی نے جاہلوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے "فجر صادق" نامی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا اور معروف خطیب سید صالح حلی کا مقابلہ کرنے کے لیے نجف کے نزدیک واقع بعارہ میں سکونت پذیر خطیب شیخ محمد علی یعقوبی کو دعوت دی۔ شیخ یعقوبی نے اپنی شعلہ بیانی سے طلاب کو سید محسن امین کی اصلاحی تحریک سے آگاہ کیا اور آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کے فتوی کا بھرپور دفاع کیا۔ یہاں تک کہ سید صالح کی تقاریر کے اثرات زائل ہونا شروع ہوگئے اور سید محسن امین کے پیروکاروں پر امویت کا الزام ہمیشہ کے لیے حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔

نجف اشرف دوبارہ آمد

سید محسن امین کی اصلاحی تحریک کی کامیابی کے سلسلہ میں محنتی اور نوجوان استاد خلیلی جنہوں نے تحریک کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا، دمشق پہنچے اور سب سے پہلے سید محسن امین کی زیارت کے لیے محسنیہ اسکول کے نزدیک واقع ان کے گھر تشریف لے گئے۔ جہاں سید محسن کو نجف اشرف کے حالات سے سے ا؟ گاہ کیا اور اہم

فیصلے کیے۔استاد خلیلی کی نجف آمد کے بعد سید محسن امین کے نجف آنے کی خبریں گردش کرنے لگیں۔سید محسن امین کے طرفدار بھی سید کے اس سفر کے حامی نہیں تھے بعض نے تو با قاعدہ سید محسن امین کو خط تحریر کیا اور اس سفر کو مصلحت کے خلاف قرار دیا۔سید محسن امین انتہائی شجاع اور مصلحت اندیش آدمی تھے انھوں نے اس موقعہ کو بہترین فرصت قرار دیا اور نجف اشرف کے لیے روانہ ہو گئے۔

سید امین کی نجف آمد کی خبر جنگل میں آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی نے باقاعدہ اشتہار کے ذریعے علماء اور عوام کو سید امین کے استقبال کی دعوت دی۔لوگوں نے سید محسن امین کا ایسا شاندار استقبال کیا جو نجف کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔اس استقبالیہ تقریب میں علماء ،فضلاء،تجار،اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ سید محسن امین کے شدید مخالف شیخ کلوالحبیب نے بھی شرکت کی اور علامی سید محسن امین کا ہتھ چوم کر فرمایا" لعن اللہ من غشنی ھا ھوذا وجھک النورانی یشع بالایمان فاغفر لیسوء ظنی "خدا لعنت کرے ان لوگوں ہر جنھوں نے مجھے گمراہ کیا۔یہ تمھارا نورانی چہرہ نور ایمان سے دمک رہا ہے۔مجھے میری بدگمانی کی وجہ سے معاف کر دینا۔

اس دن سید محسن، آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کے مہمان بنے اور اس کے بعد استاد خلیلی کے ہمراہ جبل عامل کے طلاب سے ملاقات کے لیے شیخ خلیل مغنیہ کے یہاں تشریف لے گئے۔شیخ خلیل جنھوں نے آج تک سید محسن امین کو نہیں دیکھا تھا سید کے سامنے ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھے رہیا اور جبل عامل کے طلاب جو سید محسن کی اصلاحی تحریک کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اپنے کیے پر پشیمان تھے اور اس ڈر سے کہ کہیں استاد خلیلی ان کے سابقہ موقف سے پردہ نہ اٹھا دیں استاد خلیلی کی جانب خصوصی توجہ کر رہے تھے۔

علمائے نجف نے سید امین کی تکریم اور عزت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور ایک عرصہ تک سید محسن امین کے اعزاز میں ولیمہ دیتے رہے۔علامہ سید محسن امین نے نجف اشرف میں اتنا عرصہ قیام فرمایا کہ اموی اور علوی اصطلاح کا خاتمہ ہو گیا اور سید محسن کو یہ موقعہ بھی مل گیا کہ انھوں نے اپنے اصلاحی نظریات "التنزیہ" نامی جریدے میں شائع کیے۔

پہلی عالمی جنگ اور وبا

۲۳۹۱ء(۲۳۳۱ھ) میں جب عالمی جنگ شروع ہوئی تو سید محسن امین اس وقت جبل عامل میں سکونت پذیر تھے۔انھوں نے سوچا کہ اگر دمشق منتقل ہو جائیں تو شاید کم خطرات کا سامنا کرنا پڑے۔چنانچہ شقراء میں موجود

تمام اموال فروخت کر کے دمشق روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ دمشق میں رہنا بھی خطرات سے خالی نہیں ہے لہذا دوبارہ جبل عامل پلٹ آئے۔ اسی دوران "زرد ہوا" نامی وبا پھوٹ پڑی یہاں تک کہ شقراء جیسے چھوٹے سے دیہات میں صرف ایک دن میں بارہ افراد لقمہ اجل بن گئے۔ بھائی بھائی کی میت اٹھانے سے کترا رہا تھا۔ لوگوں کی کوشش تھی کہ غسل وکفن کے بغیر ہی مردوں کو دفنا دیا جائے۔ سید محسن امین نے لوگوں کو غسل وکفن دینے پر آمادہ کیا اور خود بھی اس سلسلہ میں کافی مشقت اٹھائی۔ کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنازہ اٹھانے کے لیے چار آدمی میسر نہیں ا? تے تھے اور سید محسن تنہا ہی یہ کام اجنام دیتے تھے۔

بہر حال وقت گزرتا رہا اور علامہ محسن امین ایک عالم دین کی حیثیت سے لوگوں کی مشکلات حل کرنے اور انھیں دلاسہ دینے میں مشغول رہے۔ حتی کے جنگ کے دوران بھی اختلافات دور کرنے کے لیے جبل عامل کے اطراف مثلا "ہرمل" وغیرہ کا سفر کیا اور اس تمام دوران میں قومی اور قبائلی اختلافات کے خاتمے کے لیے کوشاں رہے۔

دمشق واپسی

جنگ عظیم اول کے ختم ہونے کے بعد علامہ محسن امین جبل عامل کے علماء اور دیگر شخصیات کے ہمراہ دمشق تشریف لائے تا کہ دمشق کے بادشاہ ملک فیصل کے جشن تاج پوشی میں شرکت فرمائیں۔ سید محسن امین کے بقول یہ واقعہ ۱۳۳۹ھ میں رونما ہوا اور اسی سال برطانوی سامراج شام سے واپس چلا گیا۔ البتہ فرانسوی استعمار مزید ایک سال تک دمشق میں ڈیرے ڈالے رہا۔

شیعہ سنی مفاہمت

شام پر فرانس کے قبضہ کے دوران سید محسن امین نے مسلمانوں کی آزادی اور شیعوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بہت زیادہ کوشش کی اور شیعوں کی فکری اور اخلاقی سطح بلند کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سید محسن امین نے غیر اخلاقی حرکتوں میں مبتلا خواتین کی بیماریوں کے علاج اور شرافت مندانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ایک فلاحی ادارے کی بنیاد رکھی۔

سید محسن امین نے طلاب کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے انتہائی اہم اقدامات کیے۔ سید امین جانتے تھے کہ طلاب کا زیادہ وقت دشوار عبارات اور قدیم کتب کو سمجھنے میں صرف ہو جاتا ہے یا بعض اوقات ایسی مباحث پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں جن کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے سید محسن امین نے کمر ہمت باندھی اور مختلف سطوح کے لیے نصابی کتابیں تحریر فرمائیں۔

سید محسن امین کی کتب اور مقالات نے لبنان اور شام میں شیعوں کی اجتماعی حالت پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور مختلف مذاہب کے درمیان موجود غلط فہمیوں میں کافی حد تک کمی ہوئی اور وحدت واتحاد کی ایسی فضا سازگار ہوئی کہ شیعہ اور اہل سنت سید محسن امین کو اپنا مشترکہ رہبر تسلیم کرنے لگے۔ جب سید محسن امین کے مخالف علماء اور اہل منبر نے ان کی صداقت اور ایمان کا مشاہدہ کیا تو اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور مختلف طریقوں سے سید محسن امین سے معافی کے طلب گار ہوئے۔

سید امین کی سیاسی خدمات

علامہ سید محسن امین علمی اور مذہبی شخصیت ہونے کے علاوہ شام کی آزادی کے علمبردار شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ تحریک آزادی شام "الحرکۃ الوطنیۃ فی سوریۃ" اور ۱۳۵۵ھ میں شامیوں کی شش ماہہ ہڑتال اور احتجاج جو غیروں کے شام سے بے دخل ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوا، سید محسن امین کے گھر سے ہی شروع ہوا تھا۔

سید محسن امین نے دنیائے عرب اور جہان اسلام کو مسئلہ فلسطین کی جانب متوجہ کرنے کے لیے تقاریر، مقالات اور مالی امداد اکٹھی کرنے کے علاوہ سال میں ایک دن کو "یوم فلسطین" قرار دیا جو ہر سال شان وشوکت سے منایا جاتا تھا۔ سید محسن امین واحد مسلمان عالم دین تھے جو کبھی بھی قابض فرانسیسیوں کے پاس نہیں گئے اور نہ ہی کبھی ان کی دعوت قبول کی اور ببانگ دہل اعلان کیا کہ میں خداوند متعال کے احکام کا پابند ہوں فرانسیسیوں کا نہیں۔ ایک مرتبہ فرانس کے اعلی سطحی کمشنر نے سید محسن امین کے گھر آ کر بادشاہ شام ملک فیصل کے بارے میں نامناسب باتیں کی تو سید نے فرمایا: "چونکہ آپ میرے گھر آئے ہوئے ہیں۔ مہمان داری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں نازیبا کلام زبان پر لاؤں لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ چال بازی سے کبھی بھی حق کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ یاد رکھنا کہ شام کے عرب تم سے اپنا حق چھین لیں گے اور بالآخر تم پر فتح پائیں گے۔

سید محسن امین شام کے شیعوں سے کہا کرتے تھے کہ حریت پسندوں کے لیے بہترین نمونہ تنبا کو کے خلاف ایرانی قوم کی تحریک ہے۔ اگر کوئی قوم کسی بات کا فیصلہ کر لے اور اس پر ڈٹ جائے تو کامیابی اس کے قدم چومے گی اور کوئی استعماری طاقت اس کے سامنے تاب نہیں لا سکتی۔ علامہ امینی جو کہتے اس پر خود بھی کاربند رہتے تھے اسی وجہ سے آپ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ فرانسیسی استعمار کے اقدامات کے خلاف سید محسن امین کا سیاسی موقف شجاعانہ اور منطقی بنیادوں پر استوار تھا۔ جب فرانسیسی استعمار نے مسلمانوں کو اقوام اور قبائل میں تقسیم کرنے والا

قانون "قانون طوائف" تصویب کیا تو سید امین نے انتہائی سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور اسے اسلامی شریعت سے متصادم قرار دیا۔ سید امین کے اس موقف کی تائید میں بہت سے علماء بھی حرکت میں آ گئے اور اس قانون کو لغو کرنے کا مطالبہ کیا۔ مجبورا فرانسیسیوں نے اس قانون کو ملتوی کر دیا اور ایک بیان صادر کیا جس میں کہا گیا کہ یہ قانون صرف اہل سنت مسلمانوں سے مخصوص ہے۔ علامہ امین نے اس فیصلے کی بھی مخالفت کی اور عربی وفرنچ زبان میں ایک بیان صادر کیا جسے اخبارات نے شائع بھی کیا۔ بیان میں سید امین نے مسلمانوں کو امت واحدہ قرار دیا اور شیعہ سنی کی تفریق کو نا قابل منظور گردانا۔

فرانسیسی استعمار نے سید محسن امین کو خاموش کرنے کیلیے لبنان اور شام کے شیعوں کے رہبر کے عنوان سے تعارف کروانے اور اوقاف سمیت چند دیگر عہدوں کی پیش کش کی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ علامہ محسن امین ان تجاویز کو فورا قبول کرلیں گے۔ سید امین کے ساتھیوں کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے نتیجہ میں جب فرانسیسی نمائندہ سید امین کے یہاں تمام مربوطہ دستاویزات لیکر پہنچا اور سید کی خدمت میں پیش کیں تو انھوں نے فرمایا: " قل لصاحبہ ان ھذا الامر لا اسیر الیہ بقدم ولا اخط فیہ بقلم ولا انطق فیہ بفم ؛ یہ دستاویز تیار کرنے والے سے کہہ دو کہ میں اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا، اپنے قلم سے ایک لفظ بھی نہیں لکھوں گا اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی بات کروں گا"

اس واقعہ کے بعد فرانسیسیوں نے ایک طرف اپنا خصوصی نمائندہ سید محسن امین کو راضی کرنے کے لیے روانہ کیا اور دوسری طرف سے لبنان اور شام کی اہم شخصیات کے ذریعہ سید پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن کوئی حربہ بھی کامیاب نہیں ہوا اور علامہ محسن امین فرانسیسی اقدامات کی مخالفت کرتے رہے اور شام میں ان کی موجودگی کے خلاف تحریک چلاتے رہے۔

سید محسن امین کی تحریک اور مقاومت کے نتیجہ میں شام ۱۳۵۵ھ میں آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد پارلیمنٹ کی تشکیل ضروری تھی لیکن شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سیٹوں کی تقسیم ایک ایسا مسئلہ تھا جو عوامی انتخابات کے ذریعہ حل ہوسکتا تھا۔ سیٹوں کی تقسیم کے نتیجہ میں شیعہ اقلیت کا روپ دھار جاتے۔ سید محسن امین اولا تو شیعہ سنی کی ہر اس تقسیم کے مخالف تھے جس سے فرقہ واریت کی بو آتی تھی اور ثانیا اس تقسیم کے نتیجہ میں شیعوں کو اقلیت قرار دیا جاتا۔ سید محسن امین نے حکومت کو خط تحریر کیا کہ اہل تشیع کے نزدیک تمام مسلمان امت واحدہ ہیں اور شیعوں نے کبھی

بھی اپنے اہل سنت بھائیوں کے ساتھ افتراق کی پالیسی نہیں اپنائی۔ سید امین کے اس خط کو تمام محبّ وطن افراد نے بہت سراہا اور حکومت تصویب کیا کہ:

"ان المسلمين طائفة احده لافرق بين سنيهم و شيعيهم و ان هذه المقاعد المعينة للمسلمين فی جميع انحاء الدولة السورية هی للسنين و للشيعين علی السواء"

''تمام مسلمان ایک ملت ہیں اور شیعہ سنی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ملکی حدود میں مسلمانوں سے مخصوص سیٹیں شیعہ اور اہل سنت کے درمیان مشترک ہیں"

عوام اور علماء میں سید محسن امین کے اثر رسوخ کی وجہ سے حکومت، سید کا خصوصی احترام کرتی اور ان کی تجاویز کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

علامہ سید محسن امین کے مذہبی سفر

علامہ سید محسن امین ۱۲۳۱ھ میں خانہ خدا کی زیارت کے لیے اہل خانہ کے ہمراہ دمشق سے روانہ ہوئے۔ میڈیٹیرین سی کے راستے مصر گئے، پورسعید اور اسماعیلیہ سے گزرتے ہوئے قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ میں "مقام راس الحسین" کی زیارت کی اور اس عظیم مقام کی حرمت کا پاس رکھنے پر اہل مصر کی تعریف فرمائی۔ مصر میں حضرت محمد ابن ابی بکر اور امام شافعی کی قبر پر حاضری دینے کے بعد اہرام مصر تشریف لے گئے اور وہاں سے الازہر یونیورسٹی گئے۔ الازہر میں تعطیلات کی وجہ سے زیادہ نہیں رک سکے۔ قاہرہ میں مقیم شامیوں نے سید محسن امین کی مہمان داری کے فرائض انجام دیئے۔ مصر کی بندرگاہ پورتوفیق کے راستے مکہ پہنچے اور اعمال حج کی بجا آوری کے بعد راہی مدینہ ہوئے۔ مدینہ میں قبر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی اور سیدھے دمشق لوٹ آئے۔

اس سفر میں ایران بدر، صدر اعظم میرزا علی اصغر خان بھی سید امین کے ہمراہ تھے۔ میرزا علی اصغر خان نے دمشق میں مدرسہ علویہ کا دورہ کیا اور مالی اعانت بھی فرمائی اور اس کے علاوہ حضرت رقیہ بنت الحسین کے مزار پر قبہ تعمیر کروایا۔

اس سفر کے بعد اسی سال سید امین دوسری اور تیسری مرتبہ مدینہ تشریف لے گئے اور مدینہ کے شیعوں کی مشکلات کا نزدیک سے مشاہدہ کیا اور اہل مکہ اور شیعیان نخاولہ کے درمیان موجود اختلافات کے حل کے لیے کافی

تگ ودو کی۔

اسی سال سید محسن امین بیت المقدس تشریف لے گئے۔ جنگ عظیم اول (۱۳۳۱ھ-۱۳۳۲ھ) کے بعد دوبارہ بیت المقدس گئے اور یہود و نصاری کی عبادات کے بارے میں آگاہی حاصل کی اور اچھے تجربات سے گزرے۔

سید محسن امین ۱۳۴۱ھ میں ایک مرتبہ پھر حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس مرتبہ زیادہ تجربات اور اچھے دوستوں کی ہمراہی کی وجہ سے مالی مشکلات کا شکار نہیں ہوئے۔ اس سفر کی روداد سید محسن امین کے سفرنامہ "رحلات مجازیہ" میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

۱۳۵۲ھ میں سید امین امام رضا علیہ السلام کی زیارت کے ارادے سے ایران تشریف لائے۔ نو مہینے ایران میں قیام فرمایا اور اسی سال نو ربیع الاول بروز جمعہ المبارک کو تہران پہنچے۔ علامہ سید محسن امین ایران میں ایک مصلح کے عنوان سے معروف تھے اور آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی نے علمائے ایران کو خصوصی تاکید فرمائی تھی اس لیے طلاب، علماء اور حکومتی سطح پر سید محسن امین کا تہران اور دیگر شہروں میں شایان شان استقبال کیا گیا۔ سید امین نے معقول و منقول کالج کے افتتاح کی تقریب میں شمولیت کی اور طلاب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ سید امین نے عوام کے اصرار پر نماز جمعہ و جماعت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ سید محسن امین نے اعیان الشیعہ میں ایرانی حکومت اور عوام کی طرف سے مہمان نوازی کا بہت شکریہ ادا کیا ہے اور لکھا ہے کہ میرا قلم ایرانیوں کی طرف سے کیے جانے والے احترام اور محبت کو تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔

سید محسن امین کے اساتذہ اور شاگرد

علامہ امینی کا تعلیمی دور زیادہ تر جبل عامل اور نجف اشرف میں گزرا۔ جبل عامل میں ان کے سب سے پہلے استاد چچازاد بھائی سید محمد بن سید عبداللہ تھے جن سے سید امین نے ادبیات کی ابتدائی کتب پڑھیں۔ عربی ادب کی تکمیل کے لیے جبل عامل کے دیہات "عیثا الزط" میں سید جواد مرتضی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس کے بعد منطق اور اصول فقہ کی تعلیم کے لیے بنت جبیل نامی قصبہ میں سید نجیب الدین فضل اللہ عاملی عیثائی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور حاشیہ ملا عبداللہ، شرح شمسیہ، اور معالم انھیں سے پڑھیں۔

نجف اشرف میں ان کے سب سے پہلے استاد چچازاد بھائی سید علی بن سید محمود تھے جن سے شرح لمعہ

پڑھی۔اس کے بعد مزید تعلیم سید احمد کربلائی، شیخ محمد باقر نجم آبادی اور شیخ ملا فتح اللہ اصفہانی المعروف شیخ الشریعہ سے حاصل کی اور بہت زیادہ کسب فیض کیا۔اصول کے درس خارج کے لیے عظیم کتاب کفایۃ الاصول کے مصنف شیخ ملا کاظم آخوند خراسانی کے درس میں حاضر ہوئے اور فقہ کے درس خارج کے لیے شیخ حاج آقا رضا ہمدانی اور شیخ محمد طہ نجف جیسے عظیم اساتذہ کے حضور تشریف لے گئے۔اس طرح اجتہاد کے مراحل طے کیے اور نجف کے کامیاب علماء وفضلاء کی صف میں جا کھڑے ہوئے۔

علامہ سید محسن امین جب خود اعلی تعلیم میں مشغول تھے اور تعلیم سے فراغت کے بعد بہت سے شاگردوں کی تربیت کی۔سید محسن امین کے اہم شاگردوں میں سے چند درج ذیل ہیں: سید حسن امین بن سید محمود، سید مہدی آل ابراہیم حسینی عاملی، شیخ منیر عسیران، سید امین بن سید علی حسینی عاملی، شیخ علی بن شیخ محمد عاملی حداثی، شیخ عبداللطیف شبلینا صر عاملی حداثی، استاد اسیب تقی دمشقی، شیخ مصطفی خلیل صوری جو عالم شباب ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شیخ خلیل صوری، شیخ علی صوری، شیخ سرو حمصی غوری، شیخ علی شمیع حمصی غوری، شیخ علی جمال دمشقی۔

سید محسن امین کی تالیفات

سید محسن امین نے انتہائی قیمتی کتب اسلامی معاشرے کے حوالے فرمائیں۔بعض کتب کا تو عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔سید امین کی اکثر کتب پانچ صد سے آٹھ صد صفحات پر مشتمل ہیں۔تمام تالیفات میں اعیان الشیعہ انتہائی عظیم اور قیمتی کتاب درحقیقت علامہ سید محسن امین کی زندگی کا حاصل شمار ہوتی ہے۔ یہ کتاب متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہیاور عام طور پر رائج ایڈیشن دس بڑی جلدوں اور ۱۲۵ اجزاء پر مشتمل ہے۔کتاب کا آخری جزء سید محسن امین کے خود نوشت سوانح عمری اور سید محسن امین کی سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں اور علمی مقام کے بارے میں علماء اور دانشوروں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ زیر نظر مقالہ میں مذکورہ جزء سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا۔

سید محسن امین کی تالیفات جن کا ذکر انھوں نے اعیان الشیعہ کے آخری جزء (ص۳۷۳-۲۷۳) میں کیا ہے، مندرجہ ذیل ہیں:

۱ نقض الوشیعہ۔یہ کتاب موسی جاراللہ زمخشری کی کتاب الوشیعہ کا جواب ہے۔موسی جاراللہ نے الوشیعہ

میں شیعوں پر ناروا تہمتیں لگائی ہیں جن کا سید محسن امین نے جواب تحریر فرمایا ہے۔(یہ کتاب متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے)

۲ لواعج الاشجان۔تاریخ کربلا کے بارے میں(مطبوعہ)

۳ تاریخ جبل عامل

۴. اصدق الاخبار فی قصۃ الاخذ بالثار(مطبوعہ)

۵. البحر الزخار فی شرح احادیث الائمۃ الاطہار(تین مجلد شائع ہو چکے ہیں)

۶. شرح ایساغوجی۔علم منطق

۷. ارشاد الجہال۔عقائد

۸. الدر الثمین فی اصول الدین(پہلی جلد متعدد بار شائع ہو چکی ہے)

۹. التقلید آفۃ العقول۔عقائد

۱۰. حذف الفضول عن علم الاصول۔

۱۱. حواشی المعالم۔معالم پڑھتے ہوئے کتاب پر لکھی جانیوالی یادداشتیں

۱۲. حاشی ؟القوانین

۱۳. الدر المنظم فی مسئلۃ تقلید الاعلم

۱۴. اساس الشریعۃ۔فقہ(ایک جلد شائع ہو چکی ہے)

۱۵. ارجوزۃ فی النکاح

۱۶. تحفۃ الاحباب فی احکام فی آداب الطعام والشراب۔(مطبوعہ)

۱۷. التنزیہ لاعمال التشبیہ۔آداب عزاداری

۱۸. جوابات المسائل الدمشقیہ

۱۹. جوابات المسائل الصافیتیہ

۲۰. جوابات المسائل العراقیہ

۲۱.	جناح الناھض الی تعلیم الفرائض۔مسائل فقہ پر مشتمل مختصر شعری مجموعہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے: الحمد للہ القدیم الوارث المنشی ء الخلق الممیت الباعث (مطبوعہ)

۲۲.	کشف الغامض فی احکام الفرائض (وراث کے احکام کے بارے میں دو بڑے مجلد پر مشتمل کتاب)

۲۳.	سفینۃ الخائض فی بحر الفرائض (کشف الغامض کا خلاصہ)

۲۴.	حواشی العروۃ الوثقی (مقلدین کے لیے توضیح المسائل)

۲۵.	الروض الاریض فی احکام تصرفات المریض (مطبوعہ)

۲۶.	الدروس الدینیہ (۹ جلد، مطبوعہ)

۲۷.	شرح التبصرۃ۔(مطبوعہ)

۲۸.	دور العقود فی حکم زوجہ الغائب والمفقود۔ ہمسر کے غائب یا مفقود ہونے کے احکام۔

۲۹.	دروس الحیض والاستحاضۃ والنفاس (مطبوعہ)

۳۰.	الدر الثمین۔طہارت، نماز، زکات، خمس روزہ اور احکام میت کے بارے میں اہم ترین مسائل۔ (معدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے)

۳۱.	الدرۃ البھیۃ۔شرعی اصولوں اور معیار کا عرف عام کے ساتھ مقائسہ۔(مطبوعہ)

۳۲.	کاشفۃ القناع فی احکام الرضاع۔دودھ پلانے کے احکام کے بارے میں منظوم کتاب۔(مطبوعہ)

۳۳.	صفوۃ الصفو فی علم النحو۔

۳۴.	الاجرومیۃ الجدیدۃ۔علم نحو (متعدد مرتبہ شائع ہو چکی ہے)

۳۵.	المنیف فی علم التصریف (دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے)

۳۶.	حاشیۃ المطول۔مطول پڑھنے کے دوران مطالب کو منظوم تحریر کیا ہے۔

سید محسن امین نے متعصب مخالفین کے جواب میں تنقیدی اور جوابی کتب اور مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ ان جوابات میں المنار میں شائع ہونے والے رشید رضا کے جوابات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔سید محسنامین کے مجلّہ عرفان میں شائع ہونے والے جوابی مضامین میں الشیعۃ والمنار، الحصون المنیعۃ اور دعا التفریق قابل ذکر ہیں۔

سید محسن امین نے وہابیوں کے عقائد کے خلاف کشف الارتیاب فی اتباع محمد بن الوھاب تالیف کی جو بار ہا زیور طبع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔اسی سلسلہ میں سید محسن امین نے چار سو اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ بھی کہا ہے جو کشف الارتیاب کے حاشیہ پر چھپ چکا ہے۔

سید محسن امین کے ہاتھ سے تحریر شدہ سفر ناموں کو ان کے بھتیجے ڈاکٹر سید حسن امین کتابی شکل دیکر "رحلات السید محسن الامین" کے نام سے شائع کیا ہے۔ان سفر ناموں میں سے بعض مثلا الرحلۃ الحمصیہ اور الرحلۃ العراقیہ، الرحیق المختوم کے آخر میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

سید محسن امین نے عالم عرب اور اسلام کے مشہور شعراء ابو تمام طائی، ابو فراس حمدانی اور ابو نواس کیبارے میں بھی علیحدہ کتب تحریر کی ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں۔

سید محسن امین اپنی کتب میں اتحاد بین المسلمین کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس بارے میں انھوں نے "الحق الیقین فی التالیف بین المسلمین" نامی کتاب بھی تحریر اور شائع فرمائی۔اسی طرح فضائل اور مناقب اہل بیت پر مشتمل کتاب "المجالس السنیه فی مناقب العترة النبویه" لکھی۔

غروب آفتاب

سید محسن امین بڑھاپے اور جسمانی کمزوری کے باعث بیمار ہوئے تو انھیں بیروت کے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ڈاکٹرز کی کوششیں کارگر ثابت نہ ہوئیں اور سید محسن امین چار رجب ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۲ء) اتوار کی رات گیارہ بجے دار فانی کو وداع کہہ گئے۔

علم و فضلیت کی حامل عظیم ہستی کے دنیا سے اٹھ جانے کی خبر ریڈیو لبنان سے نشر ہوئی اور اس کے بعد تمام اسلامی اور عرب ممالک کے ریڈیو اور اخبارات نے اس سانحہ کی خبر شائع کی اور عالم اسلام اس عظیم شخصیت کے سوگ میں عزادار ہو گیا۔مسلمان دانشوروں اور شخصیات نے سید محسن امین کی وفات پر تعزیتی مراسلے اور مقالات تحریر کیا اور ان کی شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیےتعزیتی مجالس منعقد کی گئیں۔مجالس ترحیم کا یہ سلسلہ صرف اسلامی اور عرب ممالک تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ امریکہ اور افریقہ میں مقیم مسلمانوں نے بھی سوگ منایا۔

سید محسن امین کی نماز جنازہ بروز پیر، ۵ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ کو حکومتی اور سیاسی شخصیات، اساتید، تجار

اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے ہزاروں افراد کی موجودگی میں ادا کی گئی۔ اس کے بعد سید امین کی میت دمشق روانہ کی گئی جہاں ہزاروں لوگوں نے تشیع جنازہ میں شرکت کی اور حرم حضرت زینب کے طواف کے بعد باب الکبیر دمشق میں واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ سید کے سوگ میں تعزیتی مجالس کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ تہران میں سید امین کے لیے مجلس ترحیم ۵۱ فروردین ۱۳۳۱ ھ ش کو جامع مسجد حضرت عبد العظیم رے شہر میں منعقد ہوئی۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

منابع ومصادر:

۴۲۔آقا بزرگ تہرانی: محسن، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ، دارالاضواء، بیروت، ۰۰۴۱ھ

۵۲۔امین عاملی: محسن، اعیان الشیعہ، (قطع بزرگ) تحقیق سید حسن امین، دارالتعارف للمطبوعات، بیروت، ج ۰۱، ۳۰۴۱ھ

۶۲۔زرکلی: خیرالدین، الاعلام، دارالعلم للملایین، بیروت، ۰۱۴۱ھ

۷۲صدر حاج سید جوادی: احمد، دائرۃ المعارف تشیع، انتشارات سعید، محبی، تہران، ۹۷۳۱ھش۔

۸۲۔صدر: حسن، تکملۃ امل الآمل، کتابخانہ ا؟ یت اللہ مرعشی نجفی، قم، ۶۰۴۱ھش۔

۹۲۔کاظمی: محمد صالح، احسن الاثر، نامعلوم، تہران۔

۰۳۔کاظمی: محمد مہدی، احسن الودیعہ، نامعلوم، تہران، ج ۲۔

۱۳مجلۃ مجمع العلمی العربی، اڈیشن ۹۲۔

۲۳۔مجلّہ العرفان، اپریل، ۸۲۹۱ء

۳۳۔مدرس تبریزی: محمد علی، ریحان الادب فی تراجم المعروجین بالکنیہ اواللقب، کتاب فروشی خیام، تہران، ۴۷۳۱ھش۔

عبدالمجید سلیم[۱]، محافظ شریعت

(۱۳۷۴ء - ۱۳۰۲ء)، (۱۹۵۴ھ - ۱۸۸۲ھ)

ترجمہ: محمد باقر رضا

ماخوذ از اندیشہ تقریب شمارہ ۷

مقدمہ

اسلامی دنیا، مصر کی سرزمین کو تفکر اور تمدن کا گہوارہ سمجھتی ہے اور مصر کے لوگ 'الازہر' کو زمیں پر ایسان منظومہ شمسی سمجھتے ہیں جس نے عصر فاطمیین سے اب تک ان کی سرزمین کو منور کر رکھا ہے۔ 'الازہر' کے لوگوں نے بھی اپنے غیر تمند علماء اور قوی فقہاء میں ایک ایسے ستارے پر اپنی نظریں مرکوز کر رکھیں ہیں جس نے الازہر کو ایک نئی زندگی عطا کی؛ ایسا مرد میداں جو تقریب بین المذاہب کی کشتی کا ناخدا بھی ہوا اور اپنی زندگی کے ستارے کے ڈوبنے تک اس پر پابند رہا۔ 'مسلمانوں کو اس عظمت تک پہنچانا جس کے وہ اہل ہیں' کی آرزو کو دل میں رکھنے والے شاگردوں کی تربیت کر کے وہ اس پیغام کو اپنے بعد کے علماء تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے جو ان کے پہلے علماء نے انھیں سپرد کیا تھا اور اسی سبب ان کو 'طلایہ داران' میں شمار کیا گیا جس کے وہ حقدار بھی تھے۔ اور وہ منوفیہ کے آفتاب درخشاں، عبدالمجید سلیم تھے۔

وہ اپنی زندگی میں عظیم مصلح مثلا سید جمال الدین اسدآبادی، شیخ محمد عبدہ وغیرہ کے نام

سے آشنا ہوئے اور پھر ان کی راہ پر چل پڑے۔ وہ دو عالمی جنگوں اور اپنے ملک و دین اور قوم پر اس کے اثرات کے شاہد اور استعمار کے خلاف انقلابات، سلطنت عثمانی کے زوال، ملک میں مختلف ریاست اور جمہوری مصر کی تاسیس کے گواہ تھے۔ یہ تحریر ایسے انسان کی زندگی کو بیان کرتی ہے جس نے اتحاد و تقریب مسلمین میں اسلامی مصر کی حقیقی عزت اور حقیقی آزادی کو دکھانے کی مکمل تصویر کشی کی، اگر چہ ان کی زندگی کے وحدت اسلامی سے متعلق واقعات اور حوادث (جو کہ اس مقالہ کا اصلی مقصد ہے) اس کی علمی صلاحیتوں اور اساتید و شاگرد کے تعارف میں رکاوٹ ہیں، لیکن امید ہے کہ اس تحریر کے ذریعہ شیخ عبدالمجید سلیم کی زندگی کے کچھ گوشوں اور مصر کے سیاسی اور ثقافتی حالات کی تصویر کشی ہو سکے اور قاری کے لئے قابل استفادہ ہو۔

آغاز زندگی اور عہد طفلی

جب مصر بیرونی قبضہ اور بیرونی حکام کی خیانتوں کے بحران سے دوچار تھا اس وقت 'مدینۃ الشہداء' (منوفیہ) کے ''میت شہالہ'' (۲) نامی ایک قصبہ میں ایک واقعہ رونما ہوا جس نے بابرکت طلوع کی طرح اس گاؤں کے آسمان کو روشن کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۳۰۲ھ میں ایک بچہ کی ولادت کا واقعہ تھا، اور والدین نے اپنے معبود کی مجد و عظمت کے پیش نظر اس کا نام عبدالمجید رکھا۔ عبدالمجید کو بچپن سے ہی ذہین اور زیرک سمجھا جاتا تھا۔ اپنے بچپن کو روز کے شور شرابوں اور بیرونی حملوں کے ہلڑ ہنگاموں سے دور، والدین کے زیر تربیت اپنے چھوٹے سے گاؤں (میت شہالہ) میں گزارا۔ گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح لکھنے پڑھنے سے آشنائی ہوئی، اس فرق کے ساتھ کہ والدین کی طرف سے بڑی دلچسپی اور سنجیدگی کے ساتھ تعلیم و تربیت کی دیکھ بھال رہی یہاں تک کہ قرآن کو مکمل حفظ کر لیا اور پھر اس کی قرائت میں بھی بڑی محنت و کوشش کی۔

اب رخت سفر باندھنے اور علم و ایمان کے گہوارہ اور عشق عرفان کے معبد یعنی 'الازہر' کی طرف چل پڑنے کا وقت آچکا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب عربی و مصری جوانوں کے اندر مغربی علوم کی تحصیل اور ان کے رنگین مراکز میں پڑھنے کی آرزوئیں جنم لے رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس مذہبی خانوادے نے دینی فرض سمجھتے ہوئے اپنے بیٹے کو امت اسلامی اور علوم اسلامی کے مستقبل کے لئے 'الازہر' کا راہی کر دیا۔

الازہر کا ماضی

عالم اسلام میں ہر طرف جس الازہر یونیورسٹی کی گونج سنائی دینے لگی تھی وہ ۳۵۸ھ میں فاطمیوں کے ذریعہ قاہرہ میں تعمیر کی گئی۔ اس یونیورسٹی کا نام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی بیٹی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے نام پر رکھا گیا۔ کیونکہ فاطمیین اپنے آپ کو ان سے منسوب سمجھتے تھے۔ اس کی تعمیر کو چند سال ہی گزرے تھے کہ اسے یونیورسٹی کا عنوان دے دیا گیا اور اس کے شیعہ قضات نے فقہ شیعہ کے مبادی کی تدریس شروع کر دی۔ ۹۸۸ء میں فاطمی خلیفہ 'العزیز' کے دور میں رسمی طور سے کچھ اساتید کا تعین کیا گیا تا کہ دینی علوم کی تدریس کریں اور اس صدی سے الازہر یونیورسٹی کی شکل میں آ گیا جس میں دینی علوم کی تدریس ہوتی تھی۔ اور دار الحکمۃ کے نام سے ایک اور یونیورسٹی علم فلسفہ، طب، شیمی اور علم ہیئت کی ذمہ دار تھی۔

فاطمی حکومت کے اواخر میں دار الحکمۃ بند ہو گیا اور کیونکہ بارہویں صدی کے اواخر میں ایوبیوں کی حکومت آ گئی تھی لہذا انھوں نے شیعہ تعلیم اور فقہ شیعہ کی پیروی کو ممنوع قرار دے دیا اور الازہر میں نماز جمعہ کو معطل کر کے گویا اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی۔ لیکن علوم اسلامی کے ساتھ علم طب، نجوم، فلسفہ و منطق کے اضافہ سے الازہر کی رونق بڑھ گئی۔ ساتویں ہجری کے بعد عباسیوں کی حکومت کے خاتمہ اور اسپین میں اسلامی ثقافت کے مرکز یعنی قرطبہ کی ویرانی کے بعد الازہر یونیورسٹی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی بن گئی جہاں مختلف اسلامی ملکوں سے لوگ آیا کرتے تھے اور اس کے رواقوں میں تحصیل علم کرتے تھے اور یہ نظام آج تک اسی طرح برقرار ہے۔

الازہر میں تعلیم کا طریقہ وہی حلقوی ہے جو کہ تمام اسلامی مدرسوں میں رہا ہے یعنی تمام شاگرد استاد کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور کسب علم کرتے ہیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں یہ یونیورسٹی اپنے مکمل اوج وعروج تک پہنچی لیکن مصر پر عثمانیوں کے تسلط کے سبب تین صدیوں تک ترقی سے رکی رہی لیکن پھر بھی اس کی شہرت برقرار رہی۔ اٹھارہویں صدی میں جب فرانسویوں نے مصر پر یلغار کی تب بھی الازہر نے اپنی عظمت و طاقت کو بچائے رکھا اور علمائے الازہر قوم کے سیاسی قائد و پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ۳۸۹ و ۳۹۰؛ دیکھئے: دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، مادہ الازہر و...) ایسی مذہبی تاریخ رکھنے والے مرکز میں عبد المجید نے قدم رکھا اور دیگر دینی طلباء کی طرح علمائے دین کی صحبت پائی۔

الازہر میں تحصیل

انھوں نے تعلیم کے زمانے میں دینی علوم اور دیگر معلومات کے بارے میں اپنی سطح کو بڑھانے میں کافی

دلچسپی دکھائی، یہاں تک کہ ان کے ہم درس طلباء اور الازہر کے اساتید نے اس کا احساس کیا۔ علی عبدالعظیم کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ:

''انھوں نے پہلے قرآن کریم کو اچھی طرح حفظ کیا پھر الازہر کا رخ کیا۔ وہ ذہین اور لائق طالبعلم تھے اور کسب فنون میں مشغول ہو گئے۔ انھیں تحصیل علوم کا بڑا شوق تھا۔ اور اسی سبب الازہر کے عام اور معمول کے دروس پر اکتفاء نہیں کیا اور جنبی دروس (فلسفہ) کو بھی پڑھا یہاں تک اپنی دوستوں میں 'ابن سینا' مشہور ہو گئے'' (مشیخہ الازہر، ج۲، ص۱۰۷)۔

الازہر میں عبدالمجید کے اساتید

اگرچہ الازہر سے پہلے کی تحصیل اور حفظ قرآن کے سلسلہ میں ان کے اساتید اور مربیوں کے تئیں کسی طرح کی معلومات نہیں ہیں، لیکن الازہر کے زمانے کے مشہور اساتید کے بارے میں کچھ محفوظ ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں بزرگ اساتید اور نامور محدثین سے استفادہ کیا۔ اور ادبی، کلامی، تفسیری، حدیثی اور فقہی دروس کو کامیابی سے طے کیا۔ علی عبدالعظیم نے اختصار کے ساتھ لکھا ہے:

''تعلیم کے لئے بزرگ اساتید مشائخ کا انتخاب کیا۔ امام محمد عبدہ کے درس میں حاضر ہوئے اور پانچ سال تک جاری رکھا۔ اسی طرح شیخ حسن طویل عالم بزرگ احمد ابی خطوہ اور دیگر محدثین اور ائمہ مدرسہ کے درس میں حاضری دی''۔ (ایضاً)

سلیم کے اساتید میں شیخ محمد عبدہ (۱۹۰۵ء۔۱۸۴۹ء) سلیم کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں مؤثر ترین استاد تھے، جنھیں ۱۸۸۸ء میں مصر کے مفتی اعظم کے عنوان سے منتخب کیا گیا۔ (رسالۃ الاسلام، سال۶، ص۴۳۱، الاہرام سے نقل)۔ استاد فاضل شیخ احمد عسکری لکھتے ہیں:

''عبدالمجید نے اصلاح میں مبادی کو استاد شیخ محمد عبدہ سے سیکھا اور بحث و درس فکر کے طریقہ کو انھیں سے کسب کیا۔ امام محمد عبدہ اسے پسند کرتے تھے اور ان کے دیگر ہم درسوں پر ترجیح دیتے تھے۔ (ایضاً)

محمد عبدالمنعم خفاجی نے عبدالمجید کے شخصیت میں عبدہ کی تاثیرات کو یوں بیان کیا ہے:

''عبدالمجید نے محمد عبدہ کے پاس کسب علوم کیا اور مضبوط عالم اور محترم شیخ ہو گئے''۔ (خفاجی، ج۱، ص۳۰۶)

کیوں کہ عبدالمجید نے ۱۸۸۲ء میں آنکھیں کھولیں اور محمد عبدہ نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی اور استاد کی

رحلت کے وقت شاگرد کی عمر ۲۳ سال تھی اور اس کے بعد بھی انھیں فارغ التحصیل ہونے میں تین سال اور لگے (ایضاً، ص ۳۰۶؛ نیز موسوعۃ اعلام مصر فی قرن العشرین، ج ۴، ص ۳۱۸) لہذا کہا جاسکتا ہے کہ اندازا استاد سے استفادہ کرنے کا سن ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان ہی ہوگا؛ یعنی ۱۸ سے ۲۳ سال کی عمر کا حصہ۔

محمد عبدہ اس زمانے میں دینی سماجی اور حتی اجتماعی اصلاحات شروع کر چکے تھے۔ وہ مصر کے مفتی بھی ہو چکے تھے اور تین جگہوں (الازہر یونیورسٹی، اوقاف، شرعی عدالتوں) میں سرگرم تھے اور سیاسی لحاظ سے خدیو توفیق اور انگریز حاکم (لارڈ کرومر) کی طرف سے بہت دباؤ میں تھے۔

دوران تحصیل میں عبد المجید کے تقریب المذاہبی اور اصلاح پسندی کے افکار اور مبانی سے آشنائی کے لئے محمد عبدہ کی مذہبی سیاسی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ بعد میں استاد سے متاثر ہوکر ان کے بعض شاگرد خصوصا عبد المجید نے ان کے اغراض وافکار کے راہ میں بڑے بڑے اقدامات کئے ہیں۔ جوان عبد المجید سلیم ایک ایسے استاد کے سامنے تھا جو اصلاح فکر دینی کے حدود میں سید جمال الدین اسد آبادی کے ہم عقیدہ اور ان کی اصلاح طلبانہ تحریک وتعلیمات سے متاثر ہوکر افکار دینی کے احیاء اور جدید زمانے کے سوالات کے لئے اسلام کی ایک نئی تفسیر کرنے کی فکر میں تھے۔

دوران تعلیم کے واقعات

جب مسلمان ملک مصر خدیو حلمی (۱۹۱۴ء - ۱۸۹۲ء) کے زیر حکومت اور برطانیہ کے زیر تسلط اور زیر پرچم تھا اور ذلت بار دور کا تجربہ کر رہا تھا اس وقت عبد المجید سلیم مصر کے لئے ایک آزاد اور اسلامی مستقبل کی فکر میں تھے اور اس جذبہ کے ساتھ تعلیم جاری تھی یہاں تک کہ سالوں بعد ۲۶ سال کی عمر (۱۹۱۸ء) میں انھوں نے الازہر سے اعلی درجہ کی فارغ التحصیلی حاصل کی۔ عبد المجید سلیم کی زندگی کے اس دور میں الازہر کے اندر علمی واداری تغییرات وتبدیلیاں انجام پائیں اور کافی کوشش ہو رہی تھی تاکہ یہ مرکز کسی طرح دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید علمی، مذہبی اور سیاسی ضرورتوں کا جواب دے سکے۔ (۳) اس دور میں عبد المجید سلیم قانون سازی مثلا مجلس الازہر کی تشکیل کے قوانین، الازہر کی تدریس میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے امتحان، الازہر میں شہریہ جمع کرنے کے طریقہ (۱۸۹۵ء)، علمی درجات کے قوانین اور جامع الازہر (۱۸۹۶ء) کے قوانین سازی کے شاہد تھے۔

اس کے علاوہ عبدالمجید سلیم اس مرحلہ میں کچھ اور تلخ واقعات سے روبرو ہوئے۔ مقبوضہ مصر میں ان کے بزرگ اساتید اور علمی شخصیات اور عظیم مصلح کی رحلت ان کے دل کو تڑپاتی تھی۔ ۱۸۹۷ء میں انھیں اسلامی تحریک اصلاح پسندی کے بانی سید جمال الدین اسدآبادی کی وفات حسرت آیات کی خبر ملی اور اس کے پانچ سال بعد (۱۹۰۲ء) جمال الدین اسدآبادی اور محمد عبدہ کے مکتب اتحاد اسلامی کی سب سے نمایاں شخصیت عبدالرحمٰن کواکبی کے کوچ کی خبر ملی۔ کواکبی اہل حلب اور ایرانی الاصل تھے۔ مصر میں ہجرت کے بعد ۱۸۹۹ء میں انھیں قضاوت شرعی کے منصب کا عہدہ ملا اور دیگر ممالک کے سفر کے بعد وہ مصر پلٹ آئے اور جمال الدین کے حاصل افکار، محمد عبدہ سے آشنا ہوئے (موثقی، ۱۳۷۱، ج ۴/، ص ۵۲/ ـ ۵۷)۔ سب سے بڑی مصیبت جو عبدالمجید سلیم کے اوپر پڑی وہ ان کے محترم اور عزت مند شیخ محمد عبدہ کی وفات تھی جو ۱۹۰۵ء میں ہوئی۔

عبدالمجید سلیم کے اس مرحلہ زندگی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی مفکرین اور دانشوروں نے عالم اسلام کی عزت رفتہ کو واپس لانے کی کوشش کی اور دینی اصلاحات کی تحریکیں وجود میں آئیں۔ اس لحاظ سے عبدالمجید سلیم نے عالم اسلام کے حساس ترین واقعات کے دور میں زندگی گزاری۔ اس دور میں ان تحریکوں کو بھی دیکھنا چاہئے جن کو بعد میں عبدالمجید سلیم نے آگے بڑھایا یعنی اسلامی وحدت وتقریب کی تاریخی رفتار وانداز۔ جب عبدالمجید سلیم کی فارغ التحصیلی میں دو سال باقی تھے تو علامہ شرف الدین موسوی عاملی مصر میں سلیم بشری سے علمی روابط برقرار کر کے مذاہب اسلامی کی مزید شناخت اور رابطہ کے لئے سرگرم تھے جس تگ و دو کا حاصل 'المراجعات' جیسی عظیم کتاب ہے (دیکھئے: ایضاً، ص ۲۷۲/ ـ ۲۶۰)۔ (۴) اس طرح علمائے مصر کے صدر سلیم بشری (۱۳۳۵ھ۔ ۱۲۸۴ھ) سے آشنا ہوئے اور دونوں مشترک درد کی دوا کے لئے قدم اٹھاتے تھے۔ اس واقعہ کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہو جاتی ہے کہ عبدالمجید سلیم اسی راہ کے راہی ہیں جس کو ان کی جوانی کے زمانے میں سلیم بشری اور سید عبدالحسین شرف الدین نے اختیار کیا تھا اور آخرکار عبدالمجید سلیم بھی ان کے شاگرد شیخ محمد شلتوت کے ذریعہ اس تمنا تک پہنچتے ہیں: ''اسلامی اتحاد اور پیمان برادری اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب آپ شیعہ مذہب کو قانونی اجازت دیں اور اسے چار مذاہب کی طرح ایک مذہب قبول کریں۔ شیعہ اور پیروان آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ) کی سمت شافعی، حنفی، مالکی اور حنبلی کی نگاہ اسی طرح ہونا چاہئے جیسے ایک دوسرے کی سمت ہے تاکہ اس احترام کے ذریعہ مسلمانوں کے

اختلافات ختم ہوں''۔(ایضاً،ص ۲۸)(۵)

عبدالمجید سلیم کے دور میں مصر کے ثقافتی حالات

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک عالمی جنگ نے مصر کے حالات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور برطانیہ کے مقبوضہ اس ملک کو ایک نئے تلاطم سے روبرو کر دیا۔اس سال وفد پارٹی برطانیہ کے ٹینکوں کی پشت پناہی میں اقتدار تک پہنچی جو کہ ۱۹۳۶ء کا معاہدہ کر کے مصر کو جکڑنے اور سعد زغلول کی پارٹی کو عوام سے جدا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی، یہ پارٹی غیر مذہبی خصوصیت کے ساتھ سامنے آئی، اس نے ''دین خدا کے لئے اور وطن سب کے لئے؛ حق، اقتدار سے بالاتر اور قوم، حکومت سے بڑھ کر ہے'' کا نعرہ لگایا۔(احزاب سیاسی در مصر،ص ۱۰۹)

شیخ عبدالمجید سلیم سے کئے جانے والے استفتائات اور ان کے جوابات اس زمانے کے ثقافتی حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ایک استفتاء (۲۴ رجب ۱۳۶۲ء) میں ایک مذہبی گھرانے کی خاتون لکھتی ہیں: 'جو شوہر شروع میں مجھے مکمل پردے کی رغبت دلاتا تھا وہ اب گھر سے باہر فریبی عورتوں پر نظریں گاڑتا ہے اور مجھ سے چاہتا ہے کہ بغیر چادر اور جورابوں وغیرہ کے گھومنے ٹہلنے جاؤں اور بات نہ ماننے پر مجھے طلاق کی دھمکی دیتا ہے''۔ یہ ایک استفتاء اس زمانے کے مصر کے دینی وثقافتی حالات بتا سکتا ہے وہ دور جس میں آہستہ آہستہ ثقافتی تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔

عبدالمجید سلیم اس استفتاء کے جواب میں آرائش ظاہر کر کے گھر سے نکلنے کو عورتوں کے لئے حرام بتا کر سورہ نور کی ۳۱ ویں آیت سے تمسک کرتے ہوئے لکھتے ہیں: 'خمار وہ مقنعہ ہے جسے عورت اپنے سر پر ڈالتی ہے...عورتوں کو چاہئے کہ اپنی گردن اور سینے کو نامحرم سے چھپائیں اور اگر شوہر اس کا حکم دے تو اس کی اطاعت حرام ہے کیونکہ اس نے معصیت کا حکم دیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا ہے: 'لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'. زوجہ کے اوپر شوہر کی اطاعت اس وقت واجب ہے جب شوہر کوئی حق رکھتا ہو اور سر وگردن کی آرائش کو نامحرموں کے سامنے ظاہر کرانا شوہر کے حقوق میں سے نہیں ہے اور تقویٰ اختیار کرنا اور شوہر کی اذیتوں کو برداشت کرنا واجب ہے'۔آخر میں اسے شوہر کو نصیحت کرنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کی سفارش کی ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی آیات یاد دلائی ہیں۔(الفتاویٰ الجدیدۃ،ص ۴۲۳ تا ۴۲۸)

مغربی ثقافت کے اثر ورسوخ کی ایک مثال خود مغربی رقص بھی ہے جو سماج میں پھیل چکا تھا۔ ۴ ؍رمضان ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) کو صاحب 'آخرساعۃ' محمد زنزیہ نے مرد کے اجنبی عورت کے ساتھ، عورت کے اجنبی مرد کے ساتھ اور شوہر کے زوجہ کے ساتھ لوگوں کے درمیان رقص کے بارے میں سوال کیا تو عبدالمجید سلیم نے جواب دیا کہ: 'عالم اسلام میں کسی مسلمان کو شک نہیں ہے کہ مشہور انگریزی رقص جس میں عورت مرد باہم شرکت کرتے ہیں وہ حرام ہے اور اس کی حرمت واضح و روشن ہے اور جو بھی عورت کسی اجنبی کے ساتھ ناچے یا جو مرد اجنبی عورت کے ساتھ رقص کرے وہ گنہگار ہے اور دنیا و آخرت کے اس عذاب کا مستحق ہے جس کا وعدہ اللہ نے فاسقوں کے لئے کیا ہے۔ اسی طرح جو مرد اپنی زوجہ کے ساتھ ملاعام میں رقص کرے وہ بھی اس گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ باتیں بالکل واضح ہیں اور کسی دلیل کی محتاج نہیں ہیں۔ اور جو بھی اس پر راضی ہو وہ حضور و غیاب دونوں صورتوں میں گنہگار ہے کیونکہ گناہ پر راضی ہونا بھی ایک گناہ ہے۔ جیسا کہ کفر پر راضی رہنا بھی کفر ہے۔ اور جو بھی اس برائی کو ختم کرسکتا ہو لیکن ختم نہ کرے وہ بھی گنہگار ہے۔ اللہ نے اس سے کمتر کو بھی حرام کیا ہے تو اس کو کیسے حرام نہیں کرے گا'۔ (ایضاً ص ۱۲۹۲، ۱۲۹۱)

وکیل استاد مصطفی آفندی کا استفتاء بھی اس وقت کے قابل افسوس حالات کا غماز ہے۔ وہ اسلام میں شراب کے مسئلہ، اسے غیر مسلمان کے ہاتھوں بیچنے اور مسجد کے سامنے شراب فروشی کے اڈوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ مجسمہ تقویٰ اور دین کے محافظ عبدالمجید سلیم اس طرح قلم اٹھاتے ہیں کہ اس استفتاء کے بارے میں سات صفحوں کا جواب دیتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض کی تقسیم بندی کا ذکر کر کے درحقیقت اس دور کے حکام کی ڈھیل اور غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس جواب کا کچھ حصہ یوں ہے:

''کھلے عام غیر مسلمانوں کو مسلمان شہر میں شراب سے بہرہ مند کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ شراب فروشی کا اظہار، فسق کا اظہار ہے۔ اس کام سے روکا جانا چاہئے، ہاں چھپ کر آپس میں بیچ سکتے ہیں۔ بہرحال مسلمان شہروں میں عمومی طور سے شراب کی تجارت جائز نہیں ہے'۔ (ایضاً ص ۱۵۷۲)

عبدالمجید سلیم کے استعمار مخالف افکار کی بنیادیں

فارغ التحصیلی کے بعد عبدالمجید سلیم نے اپنے اوقات کو تحقیق و تدریس وغیرہ میں گزارا اور درحقیقت

۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۶ء تک یعنی ۲۷ سے ۴۴ سال تک کی زندگی اپنی علمی شخصیت کی تکمیل اور ضروری تجربات میں گزاری ۔ وہ ان سالوں میں مصر کے بہت تلخ اور تاریخی دور سے روبرو ہوئے ۔ مصر ابھی انگریزی تسلط میں تھا یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ نے مصر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خدیو عباس حلمی کے جرمنوں کی سمت جھکاؤ کے سبب انگریزوں نے اسے معزول کردیا اور سلطان حسین امل (۱۹۱۴ء علیہ السلام ۱۹۱۷ء) کو حکومت کی کرسی پر بٹھادیا اور برطانیہ نے مسلمان ملک مصر کے سلسلہ میں اپنے تحت الحمایۃ ہونے کا اعلان کردیا (الازہر یونیورسٹی، تاریخ ہزار سالہ تعلیمات اسلامی، ص ۱۶۴) اور ۱۹۱۷ء میں سلطنت عثمانی کے بجائے مصر پر اپنی قیمومیت کا جھنڈا گاڑ دیا۔

اس ملک پر عالمی جنگ کے اثرات ابھی جاری تھے کہ ۱۹۱۹ء میں حالات نے بحران کی شکل اختیار کرلی۔ انگریز فوجی شہر شہر میں مارچ کرکے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے اور اس کے مقابل میں عوام مزاحمتی انداز کا اعتراض کرتے تھے۔ عیسائی مبلغین، ۳۷ سال سے مصر پر مسلط انگریزوں کے منحوس سائے میں تبلیغ کرتے تھے۔ اور مسلمان اور ان کے علماء اس کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش میں رہتے تھے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کی مختلف انجمنیں تشکیل دے رہے تھے۔ (خاطرات حسن البناء، ص ۳۶)

قبضہ کے دور میں وہ پارٹیاں وجود میں آتی تھیں جو دین مخالف افکار رکھتی ہوں یا دین سے لاتعلق ہوں، جیسے وفد پارٹی جسے 'نیلے نشان والی پارٹی' (جلابیب آبی) کہتے تھے اس کی قیادت سعد زغلول کے ہاتھ میں تھی، یہ ''دین خدا کے لئے اور وطن سب کے لئے؛ حق، اقتدار سے بالاتر اور قوم، حکومت سے بڑھ کر ہے'' کا نعرہ لگاتا تھا۔ اور اس پارٹی کے بنیادی ممبروں میں زغلول ہی مسلمان تھا (احزاب سیاسی مصر، ص ۱۱۱ تا ۱۰۹)۔ انگریزوں کے خلاف ہونے والے اقدامات مصر میں محدود نہیں تھے اور ۱۹۲۰ء میں عراق کے لوگوں نے بھی قیام کیا اور آخر کار دو سال بعد انگریز فؤاد کے حاکم ہونے سے حالات کا رخ بوڑھے استعمار پسند برطانیہ کے فائدے میں مڑ گیا۔ چودہ سال تک مصر کی حکومت اس کے ہاتھوں میں رہی۔

۱۹۲۴ء میں عثمانی حکومت کا تختہ پلٹنے اور مصطفی کمال 'آتاترک' کے حاکم ہونے اور عربستان میں وہابی حکومت کی تشکیل کے بعد مصر کی مذہبی، ثقافتی اور سماجی حالت بالکل ہی بدل گئی اور اسی زمانے میں عبدالمجید سلیم نے

استعمار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا عزم مصمم کرلیا اور مسلمانوں کی اسی زبوں حالت کو دیکھ کر انھیں اس کے سبب یعنی تفرقہ کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اس پورے دور میں الازہر اپنی توان بھر اپنا پورا فرض نبھاتا تھا اور اس کے طلاب وعلماء کی کوشش رہتی تھی کہ اسلامی بنیادیں محفوظ رہیں، مصر کے سیاست دانوں کا تعاون کرنا بھی اسی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے، اس کے علاوہ حسن البناء جیسی شخصیت بھی مصر کو دی۔ ڈاکٹر رجب البیومی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''الازہر نے ۱۹۱۹ء کے قیام میں حصہ لیا اور علمائے الازہر نے استقلال واتحاد کے لئے قیام کیا جن میں مصطفیٰ القادیانی، محمود ابو العیون، عبدربہ مفتاح، محمد عبد اللطیف دراز اور علی سرور زنکلوئی شامل ہیں''۔ (بیومی، ص ۶۸)

ڈاکٹر رفعت، سید احمد البیومی کے کلام کے بعد لکھتے ہیں:

''الازہر غیروں کو نکالنے اور استقلال طلبی کی تحریکوں میں ہمیشہ شریک رہا ہے وہ وطن کے انقلابی دھڑوں سے مل جاتا تھا، اگرچہ اندرونی حکام کے مقابلے سے بچتا تھا''۔ (الدین والدولۃ والثورۃ، ص ۲۳۶)

قابل توجہ یہ ہے کہ علم کے عالی درجات پا جانے اور 'کبار العلماء' کی جماعت میں آجانے کے بعد بھی عبد المجید سلیم انھیں انقلابی شخصیتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں، 'کبار العلماء' میں بھی اور اجتماعی امور کی اصلاح کے لئے بھی، نیز 'جماعت تقریب' میں بھی۔

مصر کی اس وقت کی حالت کافی پریشان کن تھی۔ برطانیہ کے بوڑھے استعمار نے مصر سمیت تمام وسطی ایشیا پر اپنا منحوس سایہ پھیلا دیا تھا۔ استعماری سیاست کے نتیجہ اور کمال آتاترک کی قیادت میں ترکی مغرب زدہ ہو چکا تھا، اور مغربی استعماری حکومتوں کی شہ پر عرب وترک کے ٹکراؤ کے سبب 'عربی نیشنلزم' جڑ پکڑ رہا تھا اور وطن پرستی کے نام پر اسلام کے خلاف حملہ کرنے کا بہانہ پیدا کیا جا رہا تھا اور ایک سپر دشمنان اسلام کے ہاتھ لگ رہی تھی، تاکہ وطن دوستی کے جذبات کی آڑ میں مسلمانوں پر حملہ کیا جا سکے اور تمام رکاوٹوں کو ہٹایا جا سکے۔ مذکورہ حوادث نے انھیں یہ جرأت دی کہ مصر میں اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کر سکیں۔ اسی وجہ سے اس دور میں مصر کے اندر 'اسلام و اصول الحکم: علی عبد الرزاق' جیسی کتابیں شائع ہوئیں (دیکھئے: نقوی، ۱۳۶۱، ص ۲۰ تا ۲۳) جس میں حکومتی امور سے اسلام کو الگ کرنے کی حمایت کی گئی۔

ظاہر پرستوں کے بیمار روشنفکروں کے ساتھ مل جانے کے سبب کچھ روشنفکروں مثلاً طہ حسین نے کتابیں

لکھ کر اسلامی حقائق کو مشکوک کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً اس نے اپنی کتاب 'الشعر الجاہلی' میں قرآن کی بنیاد کے اوپر سوال اٹھایا۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے مغرب کے تیسرے درجہ کے ایک مشرق شناس کی بڑی بے وقعت کتاب کو نقل کر کے رکھ دیا ہے۔ 'السیاسۃ الاسبوعیۃ' جیسے مجلّات نے بھی مصریوں کو فرعونی دور کی طرف بازگشت کی دعوت دی اور اس کی آواز تھی کہ تاریخی لحاظ سے مصر کا عربی ممالک سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یونان اور یورپ سے مربوط ہے۔ حالات اتنے خراب اور ماحول اتنا اندھیر ہو گیا کہ کچھ علمائے الازہر کو خاموشی پر مجبور کیا گیا (دیکھئے: موثقی، ۱۳۷۱، ج ۲، ص ۱۰۲ تا ۱۰۸) البتہ ہر ایک کسی نہ کسی طرح دین کے دفاع اور اس کو خواری و ذلت سے نجات دینے کی سعی میں تھا۔ جس کے لئے سیاسی و اجتماعی لحاظ سے تند و جذباتی کام کرنے والوں میں حسن البناء کو اور مذہبی و ثقافتی اور بنیادی کاموں کے لئے عبدالمجید سلیم و شلتوت وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے اس دور میں مسلمانوں کی کمزوریوں (تفرقہ) کا پتہ لگا کر اپنی ساری عمر کو اس کے لئے وقف کر دیا۔ آنے والے صفحات میں اس طرح کے اقدامات بیان کئے جائیں گے۔ لیکن یہ اشارہ اس لئے ضروری ہے کہ عبدالمجید سلیم کی عمر کی آخری دہائیوں کے سیاسی اقدامات کی بنیادیں تقریب بین المسلمین سے میل کھاتی ہیں۔

البتہ اس دور میں بھی عبدالمجید سلیم اپنی توان بھران سرگرمیوں میں شریک تھے اگرچہ اس دور کی کچھ اجمالی معلومات ہی موجود ہیں۔ خفاجی لکھتے ہیں:

وہ مصر کی دینی، فکری، اجتماعی اور سیاسی تاریخ کے بڑے حوادث کے شاہد تھے اور ایک رہنما اور تحریک کو رخ دینے والے کے عنوان سے شریک ہوتے تھے''۔ (خفاجی، ج ۱، ص ۳۰۶)

عبدالمجید سلیم مسند تدریس پر

الازہر کے دیگر علماء کی طرح عبدالمجید نے بھی تدریس شروع کی، البتہ الازہر کی فارغ التحصیلی میں اعلی درجہ کی کامیابی نے اس راہ میں ان کی حوصلہ افزائی کی اور اطمینان بخشا۔ وہ تحصیل کردہ علمی ذخائر کے ساتھ تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ علی عبدالعظیم جہاں ان کا نام مشائخ الازہر میں لکھتے ہیں اور ان کے منصبوں کو گناتے ہیں وہیں ہر چیز سے پہلے ان کی تدریس پر زور دیتے ہیں اور لکھتے ہیں: 'کچھ منصبوں کو قبول کیا اور دینی مراکز کے اندر تدریس میں مصروف ہو گئے۔ پھر مدرسہ قضاوت شرعی میں تدریس کی'۔ (مشیخہ الازہر، ج ۲، ص ۱۰۷)۔ اگرچہ ان کی

تدریس کی تاریخ آغاز کے بارے میں کسی طرح کی معلومات موجود نہیں ہیں لیکن مختلف قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی پہلی مصروفیت تدریس ہی تھی۔ خفاجی نے ان کے شرح حال کے ذیل میں لکھا ہے:

''۱۹۰۸ء میں فارغ التحصیل ہوئے جب کہ عالم دین ہونے کا اعلی درجہ کسب کر چکے تھے...اور تدریس میں مصروف ہو گئے''۔ (خفاجی، ایضاً)

عبدالمجید سلیم کی وفات پر چھپنے والے مقالہ میں شیخ احمد عسکری نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (رسالۃ الاسلام، سال ۶۷، ص۴۳۴)

تدریس کے اسی تجربہ نے انھیں تعلیم و تربیت میں مضبوط انسان اور فقہ، کلام اور تفسیر وغیرہ میں تشنگان علوم کے سوالات کی جوابدہی میں ان کو قوی معلم بنا دیا تھا یہاں تک کہ مجلّہ رسالۃ الاسلام کے رئیس تحریریہ نے ان کی عمر کے آخری حصہ میں ان کے تدریسی تبحر اور علمی نشستوں پر تسلط کے بارے میں لکھا ہے:

'استاد بزرگ، شیخ الاسلام شیخ عبدالمجید سلیم کے جلسات سامعین سے بھرے رہتے ہیں جس میں اہل علم و اہل نظر خواص حاضر ہوتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جب فقہ، کلام، تفسیر وغیرہ کا کوئی مسئلہ چھڑتا ہے تو شیخ کی آنکھیں ذہانت و ذکاوت سے چمکنے لگتی ہیں اور پیشانی پر شکنیں آجاتی ہیں یعنی ایسی لہریں ہیں جو شور جوانی، شعور پیری، عمق بصیرت اور عجلت رکھنے والے دل سے درست اور صحیح بات کو منتقل کرتی ہیں۔ اور پھر جب وہ مسئلہ کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیتے ہیں تو دل رقص کرنے لگتا ہے اور کان بات کو مان جاتے ہیں۔ (ایضاً، سال ۱۶، ۱۳۴)۔

عبدالمجید سلیم کے شاگرد

ان کے شاگردوں کے بارے میں بھی 'محمد شلتوت' کے علاوہ کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (۶) البتہ اہل تراجم اور سوانح نویسوں کے بیانات سے ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد کا پتہ چلتا ہے۔ خفاجی ان کی وفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا جس کو کوئی چیز پر نہیں کر سکتی اگرچہ انھوں نے شاگرد اور مرید چھوڑے ہیں جو ان کے خیر و وفا اور عظمت کا ذکر کرتے ہیں''۔

عبدالمجید سلیم ہر جگہ تعلیم اور تعلیمی نظام کے اصلاح پر زور دیتے تھے جس کے لئے مجلّہ رسالۃ الاسلام میں

ان کی گفتگو کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ علوم دینی کی محققانہ تعلیم اور الازہر کے نظام تعلیم پر بعض لوگوں کے حملوں کے مقابل میں لکھتے ہیں:

''آیہ 'واعدّوا لھم ما استطعتم من قوۃ' کے مطابق علوم زندگی کو سیکھنا لوگوں پر واجب ہے اور ہمارے کچھ فرزندوں کے علوم دینی اور احکام فقہی میں مشغول ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فقہ اسلامی، زندگی کی راہ درست کے سوا کچھ نہیں ہے۔ 'لکلّ جعلنا منکم شِرعة و منهاجا' اور اس میں مصروف لوگوں پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اس کا مطالعہ، تحقیق اور غور کیا ہے بلکہ قابل گرفت یہ ہے کہ علوم عملی کے مطالعہ اور تحقیق میں کوتاہی کی جائے اور انھیں چھوڑ دیا جائے کہ امت اسلام نے علوم عملی کو چھوڑ کر صرف علوم نظری پر اکتفا کر لیا ہے''۔ (رسالۃ الاسلام، سال ۶، ص ۸)

شلتوت، ایک آئیڈیل شاگرد

عبدالمجید سلیم نے تدریس کے دوران اپنے علم کے چشمہ جوشاں سے یوں تو ہزاروں کو سیراب کیا ہے اور اگرچہ ہم تفصیل سے ان کے ناموں کے بارے میں لاعلم ہیں لیکن ان کے نمایاں شاگرد شیخ شلتوت کو خوب پہچانتے ہیں۔ شیخ شلتوت اپنے استاد عبدالمجید سلیم سے اتنا متاثر تھے کہ بعد میں اپنے استاد کی راہ تقریب بین المذاہب کو اپنایا۔ (۷) ان کا اس سے اہم قدم ان کا وہ فتوی ہے جس میں انھوں نے مذاہب اہلسنت کے ساتھ ساتھ مذہب شیعہ کو بھی رسمیت دی ہے اور اسے مانا ہے جو کہ شیخ عبدالمجید سلیم کی کوششوں کا دوام ہی ہے۔ یہ فتویٰ تقریب بین المذاہب کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تھا اور درحقیقت یہ ایک شخص کا فتویٰ نہیں تھا بلکہ ان شخصیتوں کا فتویٰ تھا جنھوں نے تقریب کی امانت کا بوجھ اٹھایا تھا اور جن میں عبدالمجید سلیم کا نام سرفہرست تھا۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۷۰)

اس طرح یہ تاریخی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس راہ میں استاد شاگرد نے ایک روح دو بدن ہو کر تقریب بین المذاہب کی مہم کو سر کیا ہے اور مذہب شیعہ کی پیروی کے جواز کے فتویٰ کا جس طرح شاگرد نے کھلے عام اظہار کیا اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ استاد کی طرف بھی اس کی نسبت دی جا سکتی ہے۔ اس فتوی کے الفاظ اس طرح ہیں:

''۱۔ اسلام نے کسی پر بھی کسی خاص مذہب کی پیروی کو واجب قرار نہیں دیا ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ہر

مسلمان کوحق ہے کہ کسی بھی ایسے مذہب کی پیروی کرے جو صحیح طرح سے نقل ہوا ہے اور اس کے احکام خاص کتاب میں تدوین کئے گئے ہیں۔ اور جو شخص بھی اس کی پیروی کرتا ہو وہ دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہو سکتا ہے وہ مذہب کوئی بھی ہو۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

۲۔ شیعہ امامیہ اثنا عشری کے نام سے مشہور مذہب جعفری ایسا مذہب ہے کہ دیگر مذاہب کی طرح جس کی پیروی جائز ہے۔ لہذا مسلمانوں کے لئے یہ جاننا بہتر ہے اور کسی خاص مذہب سے بیجا تعصب نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ کا دین اور اس کی شریعت کسی خاص مذہب کی تابع یا اس میں محصور نہیں ہے۔ لہذا سب اللہ کے نزدیک قابل قبول اور سعی و کوشش کرنے والے ہیں اور جو شخص اہل تحقیق و تفحص نہیں ہے اس کے لئے جائز ہے کہ ان کی تقلید کرے اور اپنے فقہ میں وہ لوگ جو معین کرتے ہیں اس پر عمل کرے اور اس بارے میں عبادات اور معاملات کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے''۔ (رضوی، ص ۸)

شلتوت اپنے استاد عبدالمجید سلیم کے بارے میں کہتے ہیں: ''میری آرزو تھی کہ مرحوم استاد اکبر شیخ عبد المجید سلیم ... کی طرح کوئی تصویر پیش کروں، باایمان انسان، مختلف علوم اسلامی کا عالم اور اصول وفروع میں مذاہب فقہی پر حاوی۔ وہ عظیم اور پائدار پہاڑ کی مانند تھے، ایسا شخص جس نے تقریب کے ستونوں کی مضبوطی کے لئے اہم قدم اٹھائے۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۵۲، شیخ شلتوت کے مقالہ 'تقریب کی اجمالی تاریخ' سے ماخوذ)

عبدالمجید سلیم مسند قضاوت پر

ذلت و قبضہ کے تلخ تجربوں کے بوجھ کو کاندھوں پر اٹھا کر اپنی توان بھر عبدالمجید سلیم نے کوشش کی کہ قوم کے بوجھ کو ہلکا کریں اور ایسے دور میں قضاوت کی مسند پر بیٹھنا قبول کیا جب دینی افکار کے بیان کرنے کا امکان نہیں تھا۔ وہ ۱۹۲۶ء (۸) میں قضاوت میں مشغول ہوئے۔ ان کی دوسالہ (۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء) خدمت قضاوت کے درخشاں ہونے کے لئے ہمیں اس بات سے اطمینان ملتا ہے کہ ظلم ستیزی اور انصاف خواہی کا جذبہ ان کے اندر موجود تھا اور جو بھی ان سے آشنا ہیں وہ اسے بیان کرتے ہیں۔

دارالتقریب کے جنرل سکریٹری علامہ محمد تقی لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالمجید سلیم ... ظلم کے سلسلہ میں کافی حساس تھے''۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹، ص ۱۹۱؛ دیکھئے:

احمدی و دیگران، ۱۳۷۹، ص ۲۳۵: آیۃ اللہ واعظ زادہ خراسانی)

اسی طرح مصر کے مفتی شیخ حسنین محمد مخلوف بھی عبدالمجید سلیم اور ان کے دور قضاوت کے سلسلہ میں کہتے ہیں:

''انھیں قضاوت کے لئے منتخب کرلیا گیا اور دو سال قضاوت کی...عبدالمجید سلیم کو پاکیزہ دامن قاضی، ممتاز عالم، فقیہ مجتہد، صالح اور پرہیزگار انسان، باوفا بھائی اور صابر و مخلص کے عنوان سے میں کبھی نہیں بھول سکتا، جب انھیں ستایا گیا، ان پر حملے کئے گئے اور ان پر دباؤ ڈالا گیا تو الازہر میں علم و علماء ان سے محروم ہوگئے۔ جلد ہی تاریخ ان کے اہم موقف، شجاعت، قوت ایمان اور عقیدہ کی استحکامی کا اعتراف کرے گی''۔ (۹) (رسالۃ الاسلام، سال ۶، ص ۴۳۰ تا ۴۳۶)

عبدالمجید سلیم کے دوسالہ خدمت کے زمانے میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ۱۹۲۴ء میں سلسلہ عثمانی کے سقوط اور مصطفیٰ آتاترک کے اقتدار میں آجانے سے جو مسئلہ خلافت کی تخریب کا سلسلہ چلا تھا اس میں ایک نیا موڑ آیا، یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء میں مسند قضاوت پر عبدالمجید کے آغاز کار کے ساتھ ساتھ شہر قاہرہ میں مسئلہ خلافت ہی کے سلسلہ میں ایک اہم کانفرنس ہوئی۔ اس مسئلہ نے الازہر کے علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا حتی رشید رضا جیسے افراد نے الغائے خلافت سے دس سال قبل ۱۹۲۲ء میں 'الخلافۃ والامامۃ العظمیٰ' نامی کتاب لکھی اور خلافت کے اہل افراد کی تربیت پر زور دیا، البتہ عبدالرزاق کے برخلاف جن کے نزدیک خلافت کوئی ضروری چیز نہیں تھی۔ رشید رضا نے ترکوں کو یہ تجویز دی کہ اپنی موجودہ حکومت (جمہوریت) کو 'وقتی' کی نگاہ سے دیکھیں یہاں تک کہ مسئلہ خلافت کے فیصلہ کو کسی کانفرنس کے حوالے کیا جائے، ایسی کانفرنس جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے موجود ہوں۔ اسی نظریہ کے تحت ۱۹۲۶ء میں قاہرہ کانفرنس تشکیل پائی اور اس میں تجویز دی گئی کہ خلافت کے نامزدوں کے لئے ایک مخصوص مدرسہ بنایا جائے...(موثقی، ۱۳۷۱، ج ۲، ص ۴۰)

دارالافتاء میں آغاز خدمت (۱۹۲۸ء۔ ۱۹۵۲ء)

دو سال مقام قضاوت کے عہدہ کے بعد عبدالمجید سلیم ۱۹۲۸ء میں دارالافتاء آگئے۔ یہ ۴۶ سالہ مجتہد اتنی مضبوط علمی بنیادوں کا مالک تھا کہ نئی جگہ پر آنے کے بعد بہت سے نتائج کا سبب بنا۔ وہ ۱۹۵۲ء تک اس عہدہ پر رہے۔ 'الفتاویٰ الاسلامیۃ' میں ان کے ورود کو ۲ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ اور واپسی کو ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ ذکر کیا گیا ہے۔

(الفتاویٰ الاسلامیہ، ج۱،ص۳۴) اس طولانی مدت میں صادر ہونے والے فتاویٰ کی تعداد کے بارے میں خفاجی لکھتے ہیں کہ 'پانچ ہزار سے زائد فتاویٰ رکھتے ہیں' (خفاجی، ج۱،ص۳۰۶)

اور استاد احمد عسکری نے انھیں پندرہ ہزار ذکر کیا ہے (رسالۃ الاسلام، سال ۶،ص۴۳۴، الاہرام سے منقول) اور یہ قول سچائی سے نزدیک ہے، کیونکہ بعد میں جب الفتاویٰ الاسلامیہ میں فتووں کی شمارش میں غور کیا گیا تو اس تعداد کی تصدیق اور '۱۵۷۹۲' کی تعداد کا اعلان کیا گیا۔(الفتاویٰ الاسلامیۃ، ایضاً)

فقہائے الازہر میں عبدالمجید سلیم سب سے زیادہ محنت کش تھے اور ان کے فتاویٰ کی تعداد اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔عبدالمجید کے فتاویٰ کے سلسلہ میں یہ بات بہت اہم ہے کہ کثرت فتاویٰ کے باوجود ان میں فقہی اور علمی مبانی کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے اور انھوں نے فتوی دینے میں غور وخوض کو کثرت فتاوی کی نذر نہیں کیا ہے۔شیخ احمد عسکری اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کے فتاوی ایسے ہیں جن میں ہزاروں کے اندر علمی مبادی ملتے ہیں'' (رسالۃ الاسلام، ایضاً)

خود الفتاویٰ الاسلامیہ میں علی عبدالعظیم سے اس بارے میں نقل ہوا ہے کہ ''مقام فتویٰ کی اس طویل فہرست میں فقہی فتاویٰ کا ایک عظیم سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا ہے جس میں اسلامی زاویہ سے مشکلات زندگی، نئے حوادث وواقعات اور احکام جدید شامل ہیں''۔(مشیخۃ الازہر، ج۲،ص۱۰۷)

اس غور وخوض کے ساتھ فتاویٰ کی اتنی بڑی تعداد ایک مستقل مجموعہ کی صورت میں اس کی جمع آوری کی ضرورت پر بہترین دلیل ہے، ایسا نشانہ جس کے بارے میں امید ہے کہ جلد ہی عملی ہوگا۔اسی وجہ سے استاد احمد عسکری ایک مجموعہ میں اس کے چھپنے کی خبر دے کر لکھتے ہیں:

''اس کے جمع آوری اور طباعت کے سلسلہ میں وزارت عدل کی کوششیں جاری ہیں تا کہ یہ مفید علمی محصولات سب کے لئے قابل استفادہ قرار پائیں اور بے شک یہ کتاب آئندہ تاریخ میں مفتی اور فقہاء کے لئے مرجع کی حیثیت قرار پائے گی''۔(۱۰) (رسالۃ الاسلام، ایضاً)

اس امید کے باوجود عبدالمجید سلیم کے فتاویٰ ایک مجموعہ میں جمع نہیں ہو پائے یہاں تک کہ شیخ جادالحق کے زمانے میں ان کا کچھ حصہ مصر کے دارالافتاء کے 'الفتاویٰ الاسلامیہ' نامی مجموعہ فتاویٰ میں جمع ہوا۔علی عبدالعظیم اس عظیم ثروت کی جمع آوری اور اس کے چاپ ونشر کے سلسلہ میں بہت سے لوگوں کے اشتیاق کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ یہ صرف منصب افتاء پر جادالحق کی صدارت کے زمانے میں ہی ممکن ہو پایا اور مصر کے مفتیان کی اس عظیم میراث کو کچھ لوگوں نے طبع ونشر کیا جس میں عبدالمجید سلیم کے فتاویٰ بھی آئے ہیں۔ (مشیخۃ الازہر، ایضاً، الفتاویٰ الاسلامیہ، ج ۷، ص ۲۶۸۵ سے منقول)

عبدالمجید سلیم، مجلس کبار العلماء میں

مجلس کبار العلماء الازہر کے ان ممتاز علمی شخصیتوں کا مجموعہ ہے جو الازہر کے صدر کا انتخاب کرتی ہیں۔ اس مجلس میں وارد ہونے کے شرائط میں علمی و مذہبی خصوصیات کا حامل ہونا ہے جو عبدالمجید سلیم میں پائی جاتی تھیں۔ وہ مصطفیٰ مراغی کی صدارت کے زمانے میں مجلس کبار العلماء کے عضو تھے۔

انھوں نے اس جگہ بھی اپنی علمی لیاقت کا ثبوت دیا اور اس مجلس کے نمایاں افراد میں شامل ہوگئے۔ اس مجلس میں عبدالمجید معمول کے کاموں کے علاوہ اجتماعی اور مذہبی مشکلات و مسائل کی طرف بھی توجہ رکھتے تھے اور کسی مسئلہ کے پیش آنے پر اس کے حل کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔ اس کے لئے مثال کے طور پر سماج کے اخلاقی زوال سے مقابلہ کو ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مجلس کبار العلماء میں عبدالمجید کا ورود، مصر میں اخلاقی، ثقافتی اور اعتقادی انحطاط کے عروج کے زمانہ میں تھا۔ جوان، دین مخالف لوگوں کی طرف کھنچ رہے تھے اور الحادی مکاتب فریبی طریقوں سے ان کو دین سے منحرف کر رہے تھے۔ ثقافتی میدان میں مظاہر اسلامی مثلاً پردہ اور اخلاقی اصول سے روگردانی اپنی انتہا پر تھی۔ شراب خوری اور مرد و عورت کی مشترک محفلیں نیز مقابلہ حسن کی بے شرمانہ رسوم کے علاوہ دیگر درجنوں اخلاقی انحطاط نے اس زمانے کے مصری سماج کی بڑی گھناؤنی تصویر کھینچی تھی۔ حرام مقابلے، شریعت مخالف پیشہ وغیرہ نے مل کر اس مجلس کو مشکلات کے ایک پہاڑ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا، یہاں تک کہ دین اور مظاہر دین کے خلاف یلغار کے اعلان کا ایک بہانہ ہاتھ لگا اور وہ تھا ہندوستان کی بعض ریاستوں میں شراب کا بائیکاٹ اور شیخ مرتضیٰ آل یسین کا علمائے مصر سے اسی کے مشابہ اقدامات کرنے کا تقاضا۔

واقعہ یہ تھا کہ نجف کے بزرگ عالم دین علامہ شیخ مرتضیٰ آل یٰسین نے جب حکومت ہند کی طرف سے شراب کے بائیکاٹ کی خبر سنی تو علمائے نجف کی طرف سے الازہر کے کبار العلماء کی جماعت کو ایک خط بھیجا اور ان کو تبادلہ خیال اور شراب کے خلاف ایک عمومی تحریک شروع کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے رجب ۱۳۶۹ء میں یہ خط

الازہر کو بھیجا۔

الازہر کی تقریب کی جماعت نے کبار العلماء میں سے شیخ عبد المجید سلیم اور شیخ محمود شلتوت سے رابطہ قائم کیا اور ان سے گفتگو کی۔ ان لوگوں نے بھی علامہ آل یٰسین کی تجویز کا مثبت جواب دیا اور تعاون کا وعدہ کیا۔

چند روز بعد عبد المجید سلیم کے تعاون سے جامعہ الازہر میں ایک تاریخی نشست منعقد ہوئی اور کبار العماء اور الازہر کے علماء نے اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا۔

وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ پارلیمنٹ کے اسپیکر اور مصطفیٰ نحاس پاشا کے وزراء کے پاس ایک اجتماعی خط بھیجا جائے اور ان سے مطالبہ کیا جائے کہ مصر میں شراب کے بائیکاٹ کے لئے اقدام کریں۔ اسی طرح طے پایا کہ اسی کے ساتھ ایک خط مصر کے بادشاہ کے پاس لکھا جائے اور شراب کے بائیکاٹ کی اہمیت کے بارے میں بتایا جائے۔

دونوں خط لکھ کر بھیج دیے گئے اور ۲۵ شعبان ۱۳۶۹ھ کو دوبار مصر کے سرکاری ریڈیو سے پڑھے گئے۔

کبار العلماء میں سے چند علماء نے نجف اشرف کے علماء کے ساتھ کچھ زیادہ تعاون کیا جو کہ اس طرح ہیں:

عبد المجید سلیم، شیخ محمد شلتوت، شیخ محمد عبد الطیفد راز، شیخ محمد الفتاح العنانی، شیں عیسی منون اور شیخ محمد محمد مدنی۔

الازہر کی صدارت سے مکرر استعفاء تک

عبد المجید سلیم کے سیاسی انداز نے جلد ہی اپنے اثر کو ان کے علمی و سیاسی مستقبل میں ظاہر کر دیا۔ وہ مفتی مصر کے عہدہ پر چند سال فعالت کے بعد الازہر کے صدر کو چننے والی مجلس کبار العلماء کے عضو ہوئے تھے اور پھر مصطفیٰ مراغی کی وفات کے بعد اپنی علمی صلاحیت اور عظیم شخصیت کے باوجود الازہر کے صدر کے طور پر منتخب نہیں ہوئے بلکہ حکومت نے شیخ عبد الرزاق کو اس مجلس کا صدر بنا دیا، اس طرح کہ خود عبد الرزاق بھی بجا طور سے سلیم کی ترجیح کے قائل تھے اور علی الاعلان اس کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا تھا کہ ''حکومت نے سیاسی لحاظ سے مجھے منتخب کیا ہے''۔ اسی طرح یہ دو جملے بھی انھیں کے ہیں: ''شیخ عبد المجید سلیم کا شیخ العلماء ہونا مسلم ہے اور وہ علماء میں افقہ ہیں'' (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۴۶) اور ''شیخ سلیم، مصر کے فقہاء میں سب سے بڑے فقیہ اور حتی فضل و عظمت کے لحاظ سے مجھ سے برتر و بالاتر ہیں... اگر ابوحنیفہ زندہ ہوتے اور چاہتے کہ اپنے مذہب کے لئے کوئی

متبادل معین کریں تو عبدالمجید کے علاوہ کسی کو منتخب نہ کرتے''۔ (موثقی، ۱۷، ۱۳، ص ۱۴۷) اس کے باوجود ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک عبدالرزاق اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک مامون الشناوی اس عہدہ پر فائز رہے۔ فاروق و نجیب کے دور حکومت میں سلیم کے موقفوں سے آشنائی کے لئے خود ایک مستقل تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن مجموعی طور سے یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ حکومتوں کے مقابل عبدالمجید سلیم کے موقف، دیگر علمائے اہلسنت میں رائج موقف سے زیادہ صریح اور مضبوط ہیں۔

عبدالمجید سلیم نے گیارہ ماہ کی صدارت کے بعد ۲۵/ذی حجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۸/اکتوبر ۱۹۵۰ء کو استعفا دے دیا۔ اس وقت کے حکام سے عبدالمجید سلیم کی سوچ اور انداز کے ناسازگار ہونے کے چند نمونہ نقل کئے گئے ہیں۔ مثلا فاروق کی حکومت کے توقعات کے سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا: ''میں یہاں اس طرح کے امور کے لئے نہیں بیٹھا ہوں'' (بی آزار، شیرازی، ۱۴۰۴ھ ج ۲، ص ۱۲۸) یا مثلا جب فاروق یورپ کے بندروں پر عیاشی میں مشغول تھا تو الازہر کے مالی امور میں تنگ نظری کی جاتی تھی اور بے جا بال کی کھال نکالی جاتی تھی اور سلیم سے کفایت شعاری کا تقاضا پہلے سے زیادہ ہوجاتا تھا اور یہ بات اتنی آگے نکل گئی تھی کہ شیخ نے تنگ آکر کہہ دیا تھا کہ ''وہاں اسراف اور فضول خرچیاں ہیں اور یہاں بال کی کھال نکالنا!'' (ایضاً) یہی اسباب تھے کہ حکومت سے ان کی ٹھنی رہے اور آخر کار وہ استعفاء کے لئے مجبور ہوجائیں۔ ان کے بعد ابراہیم حمروش (۱۹۵۱ء۔ ۱۹۵۲ء) صدارت کے لئے منتخب ہوئے۔ (دداج، ص ۱۶۴)

البتہ شیخ یہاں سے ہٹ کر تمام محنتوں اور زحمتوں کے ساتھ دارالتقریب میں مشغول ہوگئے وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں:

'میں نے الازہر میں تقریب و وحدت اسلامی کے اس نور کی تعقیب کی، ایسی مہم جو اسلام کے فائدے میں تھی، لیکن مجھے ملا کہ اس مشین میں زنگ لگ چکا ہے اور ایسی جگہوں کی تابعدار ہے جہاں کی نہیں ہونا چاہئے۔ اور اب اس کے بعد تقریب کے سلسلہ میں میرا انتظام و اہتمام زیادہ ہوگا اور دارالتقریب ایسی جگہ ہے جہاں ہم ایسے اسباب سے دور رہ کر کام کر سکتے ہیں'۔ (بی آزار، شیرازی، ایضاً، ص ۱۲۹)

۱۹۵۲ء میں (الازہر کی صدارت سے سلیم کے استعفاء کے دو سال کے اندر ہی) عبدالمجید سلیم کو منا کر پھر

سے الازہر میں واپس لایا گیا، اور یہ کام انقلاب مصر کے ہم وقت تھا۔ جمال عبدالناصر کی حکومت کے مقابل بھی عبد المجید کا موقف کوئی مثبت نہیں تھا اور ناصر کے ساتھ اخوان المسلمین کی فکری سیاسی کشمکش کی طرح وہ بھی حکومت کے ہم نظر یہ نہیں تھے۔ اسی وجہ سے حکومت کے ساتھ تعاون نہ کر سکے اور بالآخر استعفاء دے دیا۔

ڈاکٹر رفعت سید احمد 'الدین والا دولۃ والثورۃ' میں ایک عام تجزیہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دور کے سیاسی نظام میں پائیداری نہیں تھی اور سیاست میں الازہر کا عمل دخل، محمد علی پاشا کے زمانے میں عثمانی کے خلاف اور اس کے مفاد میں گیا اور بعد میں الازہر کے اقتصادی استقلال کے نابود ہو جانے کا سبب بنا اور آہستہ آہستہ حکومت کی گرفت اس پر مضبوط ہوتی گئی اور اس حد تک گئی کہ مداخلت کی کثرت کے سبب عبدالمجید وغیرہ کو استعفاء کے لئے مجبور ہونا پڑا اور الازہر کے عہدوں سے بے رغبتی اور... پیش آئی۔ (رفعت سید احمد، ص ۲۳۵ تا ۲۳۸)

تقریب واتحاد کے ابتدائی قدم

۱۹۳۸ء میں استاد محمد تقی مصر میں وارد ہوئے۔ وہ ایک ایرانی عالم تھے جو حکومت ایران کی طرف سے ثقافتی امور کی انجام دہی کے لئے مصر بھیجے گئے، لیکن انھوں نے الازہر سے رابطہ کیا اور نتیجۃً عبدالمجید سلیم، محمود شلتوت، محمد فحام، محمد ابوزہرہ، محمد غزالی اور حسن البناء وغیرہ جیسے بزرگوں سے آشنا ہوئے۔ تقریب کا موضوع اسٹریٹجک کے طور پر ان کے پیش نظر تھا اور اس تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے کافی صبر و بردباری کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ تقریب کے بنیادی قواعد وضوابط کی تصویب ہی میں ۹ رسال کھنچ گئے اور یہ قوانین ۱۹۴۷ء میں تصویب پائے۔ اس دور میں مصطفی مراغی الازہر کے صدر تھے۔

تقریب کی دعوت ایک اصلاحی فکر تھی جس کی جگہ دینی اصلاح خواہی کے خانہ میں تھی، جو کہ دینی اصلاح کے بزرگ قائد مثلاً سید جمال الدین اور محمد عبدہ سے لی گئی تھی، اور مضبوط روایتی وفقہی موقف نیز مضبوط اصلاحی پہلوؤں منجملہ اجتہاد وفکر تقریب سے پر تھی۔ اور ۱۹۳۸ء میں محمد تقی قمی مصر میں وارد ہو کر اس کے سفیر بن گئے۔ انھوں نے تقریب کی منزل تک پہنچنے کے لئے تدریجی دعوت کی رعایت کرنے کو یاد دلایا۔ انھوں نے آغاز تقریب کے ۲۵ سال بعد کی تقریر میں کہا ہے:

''اللہ نے ارادہ کیا کہ اصلاحی اور دینی دعوت کی صورت میں عالم اسلام پر اس خالص اور اصلی افکار کا

سورج طلوع ہو جس کے سلسلہ میں تحقیقات انجام پائی ہیں؛ ایسے افکار جو تفرقہ واختلاف نامی مسلمانوں کے درد کی دوا کرے'' جب افکار تقریب کی ابتدا ہوئی تو بہت سے لوگ اس کے خلاف کھڑے ہوئے۔ عام لوگ تقریب کے بارے میں کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ لہذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ اصلاح سے پہلے خود اصلاح کے لئے حالات کو سازگار بنایا جائے۔ اس طرح افکار تقریب تین مرحلوں سے گزرے: ۱۔ مقدمہ چینی؛ ۲۔ تشکیل؛ ۳۔ عمل۔

تقریب کا پہلا مرحلہ

تقریب کے پہلے مرحلہ نے ۱۹۳۸ء (قمی کے مصر میں ورود) سے ۱۹۴۶ء تک طول پکڑا۔ اس دور میں ۱۹۴۴ء تک الازہر کی صدارت مراغی اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک مصطفیٰ عبدالرزاق کے ہاتھ میں تھی۔ اس زمانے میں تقریب کے ایک سال بعد سے ۱۹۴۵ء تک دوسری عالمی جنگ برقرار تھی اور تقریب کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اس دور میں عبدالمجید سلیم کما فی السابق مصر کے مفتی تھے اور الازہر کے دونوں صدران سے اچھا رابطہ رکھتے تھے اور تقریب کی مقدمہ چینی اور تشکیل میں ان سے مدد بھی طلب کی تھی۔ محمد تقی قمی، الازہر میں شیخ مراغی کی شخصیت اور عبدالمجید سلیم کو تقریب میں لانے کی ان کی کوششوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مراغی ایک باوقار، منظّم افکار اور وسیع سوچ کی مالک شخصیت تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں تقریب کے سلسلہ میں ان کی مثبت سوچ کا مجھے اندازہ ہو گیا لیکن اپنی مرکزی شخصیت کے سبب خود اس دعوت میں آگے نہیں بڑھ سکتے تھے، بلکہ اہلسنت میں اپنی زعامت وقیادت کے سبب اور الازہر اور خود اس شہر پر پھیلی فضا کے باعث آشکارا طور سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن انھیں اندازہ تھا کہ کس طرح ان افکار کی حمایت اور خدمت کی جا سکتی ہے اور اسی کے پیش نظر الازہر اور دیگر مقامات پر تقریب کا دروازہ ہمارے لئے کھول دیا اور الازہر کی شخصیات سے رابطہ قائم کرنے کے لئے کچھ سہولتیں فراہم کیں، اور ہم کو ایسی شخصیتوں سے متعارف کرایا کہ علمی تحقیقات کے سلسلہ میں جن کی صلاحتوں کے معترف تھے اور جن کے اندر تقریب کے سلسلہ میں دلچسپی پائی جاتی تھی۔

شیخ مراغی جنت سدھارے... وہ سرگرم انسان تھے اور شخصیات کے درمیان رابطہ استوار کرنے اور اہم بنیادی نقاط پر اتفاق کے سلسلہ میں ان کا اچھا خاصا حصہ تھا۔ انھوں بعض علماء و بزرگان کے لئے فضا تیار کی جن میں آگے آگے شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق اور شیخ عبدالمجید سلیم تھے۔ اگر چہ جنگ نے بہت سے آثار کو نابود کر دیا تھا اور اور

گھروں، شہروں اور لوگوں کے دلوں میں ویرانی پھیلا دی تھی لیکن اس کے باوجود لوگوں کی باہمہ محبت اور مفاہمت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہو رہا تھا''۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۸، ص ۴۵ تا ۶۶)

مصطفیٰ مراغی نے تقریب کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ ان افراد کو چنا اور متعارف کرایا جو تقریب کی راہ میں مفید ہو سکتے تھے البتہ اس راہ میں عبدالمجید سلیم کی شخصیت اتنی نمایاں تھی کہ مراغی کی تجویز کردہ فہرست میں سر فہرست تھی۔

دارالتقریب کی رپورٹ اور ایک مقالہ کی بنیاد پر مصطفیٰ مراغی نے خود عبدالمجید سلیم کو دارالتقریب کے لئے متعارف کرایا۔ اور ان کے احترام کے بہت قائل تھے۔ اور یہ مانتے تھے کہ اگر عبدالمجید سلیم کو گروہ تقریب میں لے آئیں تو یہ ایک بہت بڑا اقدام ہوگا۔ (موثقی، ۱۳۷۱، ص ۱۴۷) اس طرح عبدالمجید سلیم شروع سے ہی تقریب میں وارد ہو گئے۔ اس مرحلہ کے اہم واقعات میں الازہر کے ہزار سالہ جشن کے انعقاد کو شمار کیا جا سکتا ہے، طے پایا کہ اس جشن میں تقریب کے سلسلہ میں بھی کچھ کام کیا جائے۔ البتہ یہ جشن اگلے سال کے لئے ٹل گیا اور عالمی جنگ کا پھیلاؤ اس کے انعقاد میں رکاوٹ بن گیا۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۶۵)

ڈاکٹر بی آزار شیرازی 'ہمبستگی مذاہب اسلامی' کے پہلے چاپ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''دعوت تقریب کے استقرار کے اہم ترین ستونوں میں عالم اسلام کی ممتاز اور عظیم شخصیتوں کا اس سے منسلک ہونا ہے۔ منجملہ:.....ب: شیخ عبدالمجید سلیم اہلسنت کے افتاء وفقاہت کے بزرگ مرجع، اور ایسی قابل توجہ اور عظیم شخصیت جو اخلاقی فضائل اور وسعت معلومات میں کم نظیر تھی''۔ (ایضاً ص ۸ و ۳۷)

شیخ جامعہ الازہر ڈاکٹر شیخ محمد فحام بھی شیخ عبدالمجید سلیم کے نمایاں کردار کا ذکر کرتے تھے۔ انھوں نے منگل، ۲۲ تیر ۱۳۵۰ش کو علامہ محمد تقی قمی کے گھر پر اہلسنت کے مفتی اعظم محمد فحام اور تہران کے علمائے کرام کے درمیان ہونے والی ملاقات کو ذکر کرتے ہوئے سفیر مصر کی میزبانی کی محفل میں کہا تھا:

''مجھے علامہ قمی اجازت دیں کہ میں یہ کہوں کہ ان گراں بہا آثار والی تقریب جس میں ہمارے شیخ عبدالمجید سلیم وغیرہ جیسے مشائخ اور اساتید شریک تھے یہ سب ان (قمی) ہی کی کوشش وہمت سے میسر ہوا ہے۔ البتہ یہ شخصیات آنکھیں بند کر کے اس سلسلہ میں گے نہیں بڑھیں بلکہ یہ ایسی شخصیتیں ہیں کہ جب تک قطع و یقین کے ساتھ کسی فکر کو صحیح نہیں جانتے تب تک اس کے پاس بھٹکتے بھی نہیں ہیں، اور اس کی پیروی نہیں کرتے ہیں''۔ (ایضاً ص ۳۷۸)

تقریب کا دوسرا مرحلہ

شیخ مراغی کی طرف سے تقریب کی تشکیل وتکوین میں عبد المجید سلیم اور مصطفیٰ عبد الرزاق جیسی شخصیتوں کو میدان دینا ہمیشہ بانی تقریب محمد تقی قمی کے لئے ہمت افزا بھی تھا اور تعجب انگیز بھی۔ اس کے باوجود وہ عبد الرزاق کو تقریب کے دوسرے مرحلہ یعنی تشکیل وتکوین کا غازی مانتے ہیں۔ اس مرحلہ کو ۱۹۴۶ء میں محمد تقی قمی کی مصر واپسی سے عبد الرزاق کی علی الاعلان حمایت تک ماننا چاہئے جس کے سبب تقریب کو رسمیت ملی۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۴۶ء کو میں مصر پلٹ آیا۔ تمہیدی مراحل کے تجبوں سے ہمیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ہر دعوت سے پہلے آمادگی کے لئے ذاتی طور سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے اور ہر دعوت کی بقا کے لئے شرط یہ ہے کہ کسی شخصیت یا ذات سے ہٹا کر مسئلہ کو ایک با ایمان اور باعمل جماعت کے کاندھوں پر رکھا جائے، اس طرح کہ اگر ایک بیچ ہٹ جائے تو دوسرا اس کی جگہ لے لے۔ اس فاصلہ میں تشکیل وتکوین کا مرحلہ شروع ہو گیا''۔ (ایضاً ص ٦٦)

یہ مرحلہ ۱۹۴۷ء میں تقریب کے قانون کی تصویب کے ساتھ کامیابی سے سر ہو گیا، جس کے فعال لوگوں میں الازہر کے مجلس افتاء کے سربراہ عبد المجید سلیم کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم قمی کے بقول اس مرحلہ میں الازہر کے صدر شیخ مصطفیٰ عبد الرزاق، تقریب کے ظاہری ڈھانچے سے باہر اس تحریک کے حامی رہے تا کہ بحرانی حالات میں بہتر طریقے سے اس کی مدد کر سکیں اور درحقیقت عبد المجید سلیم کو ایک سپر کا کردار ادا کرنے موقع دیا گیا۔ علامہ محمد تقی قمی تصریح کرتے ہیں کہ مصطفیٰ عبد الرزاق اس وقت عبد المجید سلیم کو علماء کے شیخ مسلّم اور سب سے زیادہ فقیہ جانتے تھے۔ اس طرح سے شیخ عبد المجید تقریب میں آ گئے، اس مرحلہ میں تقریب کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن مشکلات کی ساری تلخی کو مصطفیٰ عبد الرزاق، عبد المجید سلیم اور محمد تقی قمی وغیرہ کی ثابت قدمی کے زیر سایہ شیریں بنالیا گیا۔ محمد تقی لکھتے ہیں:

''جس کا ڈر تھا اتفاقاً وہی ہوا؛ جیسے ہی دار التقریب کے کھلنے کی خبر متعصب لوگوں تک پہنچی وہ غضبناک ہو گئے اور فساد کھڑا کرنے لگے اور مصر میں اس وقت کے حکومتی عہدیداران کو تشویش میں ڈال دیا۔ ان کے ذہنوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا کیں۔ جیسے ہی یہ سرگرمیاں عروج پر پہنچیں مصطفیٰ عبد الرزاق حکومتی عہدیداران کے مقابل میں کھڑے ہو گئے ان اکار اور ان کے متعلقین کے بے غرض ہونے اور مصر و بیرون مصر میں ان کی شخصیت اور ان مراکز کی قدر و اہمیت کا دفاع کیا۔ اگر اس مرد میداں کا دفاع نہ ہوتا تو تقریب کا کام شروع میں ہی دم توڑ دیتا انھوں نے الازہر کے بعض اعضاء کو اس کام کے لئے انتخاب کیا اور جمعیت تقریب کے کچھ بنیادی قواعد وضوابط کو بھی

تدوین کیا''۔

پھر لکھتے ہیں: ''اور یہ وہ مرحلہ تھا کہ شیخ بزرگ عبدالمجید سلیم جہد وکوشش اور علم وایمان کے ساتھ تقریب مذاہب کی طرف آئے۔ کچھ مدت کے بعد شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق نے دنیا کو خیر باد کہا، گا یا ان کی کوئی خاص ذمہ داری جس کو انجام دیکر وہ سدھار گئے''۔(ایضاً)

لہذا عبدالرزاق کی طرف سے عبدالمجید سلیم کے انتخاب اور 'علماء کے شیخ مسلّم، علماء میں بڑے فقیہ' جیسی عبارتوں کا استعمال ان کے علمی تبحر کا پتہ دیتا ہے جس تک وہی اسی وقت پہنچ چکے تھے۔ اسی وجہ سے وہ علم و دانش کو لیکر تقریب کی مدد کے لئے دوڑ پڑے تاکہ عالم اسلام کے لئے ایک متحد مستقبل تیار کر سکے۔ تشکیل کے حساس مرحلوں میں جمعیت تقریب کے قوانین کی تدوین ہے جس میں عبدالمجید سلیم کے علم و دانش ہی نے مدد کی یہاں تک کہ استاد قمی کہتے ہیں: ''عبدالرزاق نے الازہر کے بعض علماء کو منتخب کیا اور قانون جمعیت کے بعض اساسی نکات ان کے فکری آثار میں سے ہے''۔(ایضاً، ص۴۶)

عبدالرزاق اور دیگر علماء کے اندازے کے مطابق تحریک تقریب کے مخالفت میں ایک بہت بڑی لہر دوڑ گئی اور اس طرح اعضائے تقریب کے اندازہ درست نکلا۔

اس مرحلہ میں جب عبدالمجید سلیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان الفت و محبت کا پیغام دینا چاہتے تھے، اسی وقت شیخ شلتوت کے بقول عام ماحول فرقہ پرستوں کی باہمی تنقید، الزام تراشی اور بدگمانیوں سے خراب ہوگیا۔ (اہلسنت کے مذاہب چہاگانہ اور شیعہ امامی وزیدی کی) جماعت تقریب کی تشکیل ایک واضح کامیابی تھی جس سے کینہ توز حضرات ہراساں ہوگئے تھے۔(ایضاً، ص۲۴۶)

سنی حضرات سمجھتے تھے کہ دارالتقریب ان کو شیعہ بنانا چاہتی ہے اور شیعہ حضرات سمجھتے تھے کہ ہم ان کو سنی بنانا چاہتے ہیں۔ جو حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہے تھے یا سمجھنا نہیں چاہتے تھے وہ کہنے لگے تقریب مذاہب درحقیقت مذاہب کو ختم کرنا چاہتی ہے یا ان کو آپس میں ملا دینا چاہتی ہے۔ اسی طرح کچھ تنگ نظر اور غرض مند... یا جو اپنے مفادات کو صرف تفرقہ میں دیکھتے تھے یا جن کی روح ہی مریض اور ہوا و ہوس نیز خاص رجحانات رکھتی تھی وہ سب ان افکار سے برسر پیکار تھے۔ یہ اور وہ لوگ جو اپنے قلم کو تفرقہ انگیز سیاست کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں، جو ہر اصلاحی تحریک کے مخالف ہیں اور جو مسلمانوں کو متحد کرنے والے ہر کام میں رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں وہ راست یا بالواسطہ طریقہ سے جنگ لڑ رہے تھے اور سب اپنے طور پر تحریک سے مقابلہ کر رہے تھے''۔(ایضاً، ص۳۳۔۳۴)

۱۹۴۷ء میں تقریب کے قوانین کی تصویب کو اس وقت کے تمام حاضر علماء خصوصاً مصطفیٰ عبدالرزاق، عبد

المجید سلیم اوران کے شاگرد شیخ محمود شتوت کی کوششوں کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔

تقریب کا آخری اور عملی مرحلہ

عبدالمجید سلیم کی سیاسی شخصیت کے اچھے خاصے حصہ کو دارالتقریب میں تلاش کرنا چاہئے جیسا کہ کچھ حصہ الازہر کی سرگرمیوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ سیاسی لحاظ سے عبدالرزاق اوراعبدالمجید سلیم کے درمیان کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں اس کے باوجود عبدالرزاق، سلیم کو صاحب علم وتقویٰ اور قابل اعتماد شخص سمجھتے تھے اور وہ انھیں کے توسط سے دارالتقریب پہنچے تھے۔ شیخ عبدالمجید سلیم دارالتقریب میں رہ کر بہت سے اچھے کاموں کا سبب بنے۔ علمی واجتماعی لحاظ سے بھی اور دارالتقریب میں نئی شخصیتوں کے داخلے میں بھی جواس کے مستقبل کے ضامن ہوئے۔ مثلاان کے شاگرد زیخ شلتوت اسی طرح تقریب بین مذاہب کے اصلاحی افکار کے خلاف بعض الازہر کے شیوخ کے مقابل مضبوط دفاع کے لحاظ سے۔ (دیکھئے: موثقی، ۱۳۷۱، ص ۱۴۸)

اتنی زحمتوں اور تقریب کی مہم سر کرنے کے بعد مصطفیٰ عبدالرزاق نے دار فانی سے کوچ کیا اور اس کے بعد اس کا عملی مرحلہ شروع ہوا جس میں بزرگ علماء نے امت اسلام کے لئے بہتر مستقبل کی منصوبہ بندی کی۔ محمد مصطفیٰ مراغی (۱۹۳۵ءعلیہ السلام۱۹۴۵ء) اور مصطفیٰ عبدالرزاق (۱۹۴۵ءعلیہ السلام۱۹۴۷ء) نے شیخ عبدالمجید سلیم اور شیخ محمد حسین کاشف الغطاء جیسے انسانوں کے کوشش وتعاون سے تقریب کے یہاں تک کے مرحلہ کی راہنمائی وقیادت کی اور صحیح سلامت منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ اب کچھ اور مرد میداں کی ضرورت جواس راہ کو طے کریں۔

عبدالرزاق کے بعد الازہر کی صدارت محمد مامون الشناوی (۱۹۴۸ءعلیہ السلام۱۹۵۰ء) کے سپرد کی گئی۔ اس لحاظ سے عبدالمجید سلیم صدارت کی سنگین اور عملی ذمہ داری سے فارغ البال ہوکر تقریب مذاہب کی فکر میں لگ سکتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کر سکتے تھے۔ (۱۱) یہاں پر دارالتقریب کے بانی اور ڈائرکٹر جنرل محمد تقی کی نگاہ سے تقریب کے مختلف مرحلوں میں سلیم کے کردار کو دیکھتے ہیں۔

الازہر کی شخصیتوں میں جو راہ راست یا بالواسطہ طور پر دعوت تقریب میں شریک رہی ہیں وہ اس طرح ہیں: محمد مصطفیٰ مراغی، مصطفیٰ عبدالرزاق اور عبدالمجید سلیم۔

تقریب کی آغاز فعالیت کے کچھ مدت بعد انقلاب مصر (۱۹۵۲ء) وقوع پذیر ہوا اور فاروق کو اقتدار سے بے دخل کر دیا گیا۔ اگرچہ عبدالمجید سلیم اوران کے ساتھی اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے لیکن نئی حکومت ایک ڈیڑھ سال تک تقریب کے حق میں رائے نہیں رکھتی تھی اور جاننا چاہتی تھی کہ ''یہ کونسی دعوت ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟

منصوبہ کیا ہے؟ اور اس مرحلہ پر کیسے پہنچی؟ اور یہ شخص جو ایران سے آیا ہے اور اس مہم کو چھیڑے ہوئے ہے یہ شیعہ بھی ہے اور غیر مصری بھی، اس نے کیسے تمام شخصیتوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے؟ اور بالآخر اس کے کام کرنے والے کون ہیں؟ اور اس کا پشت پناہ کون ہے؟'' (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۸، ص۳۰ و ۳۱)۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ دار التقریب کے افراد کی رفت و آمد پر نظر رکھی جاتی تھی اور ناصر کی ملاقات میں قمی کے بقول رسالۃ الاسلام فقیری کے ساتھ چلایا جاتا تھا اور لکھنے والے مفت میں مضامین دیتے تھے۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص۳۴)۔

بہر حال دار التقریب نے اپنی فعالیت کو جاری رکھا اور ناصر کے ہم مرتبہ ابراہیم الطحاوی جیسی اہم شخصیتوں کو مذہبی امور کی طرف راغب کیا، اس طرح سے کہ وہ بعد میں انجمن باب المسلمین مصر کے صدر ہوئے۔ (ایضاً)

ایسے اہم اور نازک حالات میں سب سے زیادہ شیخ عبد المجید سلیم کی طرف سے مدد ہوتی تھی۔ عبد المجید سلیم کے تقریب بین مذاہب میں اصلی کوششوں کا زمانہ ان کے الازہر کے عہدہ صدارت کا زمانہ ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں تقریب بین مذاہب کی بہت خدمت کی۔ محمد تقی فہرستی انداز میں اس دور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تقریب سے ان کی لگن اور دلچسپی اس طرح تھی کہ وہ اگر چہ چند سال بعد الازہر کی صدر ہو گئے لیکن پھر بھی جمعیت تقریب میں اپنی عضویت کو برقرار رکھا اور حتی اپنے زیادہ تر خطوط کو صدر الازہر اور نائب صدر جمعیت تقریب کے عنوان سے دستخط کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں شیعہ سنی کے درمیان رابطہ کا ایک دروازہ کھلا۔ انھوں نے علمائے شیعہ سے خطوط نویسی کا باب کھولا اور ان کے جوابات کو دریافت کرتے تھے اور پہلی بار اہلسنت کے چار مذاہب میں محدود رہنے والی الازہر یونیورسٹی کو اسلامی عمومی یونیورسٹی کی شکل دی تا کہ تقریب میں تصویب شدہ اس مادہ پر عمل کر سکے جس اسلامی یونیورسٹی کے سلسلہ میں تھا اور انھوں نے احوال شخصیہ (عائلی زندگی) سے متعلق اپنی نگاہ میں بہتر، شیعہ قوانین کو مصر کے قوانین میں داخل کیا اور انھوں نے ہی دار التقریب کو تفسیر مجمع البیان چھاپنے کی تجویز پیش کی''۔ (ایضاً ص۴۷ و ۴۸)

شیخ سلیم، تفرقہ کے مقابلے میں

دار التقریب کے آغاز کار میں ہی سب سے زیادہ دو نزدیکی بہاؤ اس تقریب اور اتحاد کی مخالفت میں اتر آئے؛ ایک استعمار اور استعماری سیاست اور دوسرے سعودی حکومت جو سیاسی کارنوں اور ضمیر فروش اور استعمار سے وابستہ قلم کے ذریعہ کتابوں اور افواہوں کو شیعوں کے مخالفت میں پھیلاتی تھی۔ خاص طور سے وہابی اور سعودی لوگ

سمجھتے تھے کہ دار التقریب کے سبب، شیعوں کے خلاف ان کے پروپیگنڈے بے اثر ہوجائیں گے۔ دار التقریب میں اخوان المسلمین کے قائد حسن البناء کی موجدگی انھیں بڑی کھلی تھی کیونکہ یہ بات اخوان المسلمین میں وہابیوں دعوت وتبلیغ میں رکاوٹ بنتی تھی۔ لہذا وہ حسن البناء کو دار التقریب سے الگ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

جب دار التقریب کے مقدس اہداف کے راہ میں شیخ عبدالمجید سلیم مذہب شیعہ کی پیروی کے جواز کے فتویٰ کی مقدمہ چینی میں مشغول تھے اس وقت استعماری کارندوں اور شیعہ سنی کے مشترک دشمنوں نے اہل سنت اور شیخین کے خلاف دورہ صفویہ کے ایک شیعہ عالم دین کی (ظاہرا شیخ علی کرکی سے منسوب) کتاب کو ڈاک کے ذریعہ دار التقریب کے تمام اعضاء کے پاس بھیجا۔ یہ کتاب مختلف بنڈلوں میں 'نفحات اللاہوت فی وجوب سب الجبت والطاغوت' کے عنوان سے ارسال کی گئی، البتہ بغیر کسی تاریخ چاپ، بغیر کسی چاپخانہ کے نام اور بغیر کسی محل (ملک) چاپ کے۔ اس کے علاوہ ہر بنڈل کو یورپ کے الگ الگ ملکوں سے بھیجا گیا تھا اور معلوم نہیں تھا کہ اس کے بھیجے جانے کا محل کونسا ہے۔ اعضائے تقریب کے ہاتھوں پہنچنے کو یقینی بنانے کے لئے اس کو دوبار پوسٹ کیا گیا تھا۔

اس کتاب کی تقسیم سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، خاص طور سے جمعیت تقریب کے لئے جو دار التقریب میں زحمت کرتے تھے اور لوگوں اور متعصبین کی ملامت کا نشانہ بھی تھے۔

تقریب کے افراد اس سلسلہ میں ہونے والی نشست میں انتہائی غصہ کے ساتھ یہ کتاب ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: 'ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ ہمیں کیا ضروری تھا کہ اتنی زحمتیں اور پریشانیاں اٹھا کر ان شیعوں کا دفاع کریں جو اصحاب کو برا بھلا کہتے ہیں اور اس حد تک آگے جا چکے ہیں؟''۔

مخالفین کی بات ختم ہونے کے بعد شیخ عبدالمجید سلیم اٹھے اور بولے: ''اے بھائیو! اگر کوئی تمہارے اجداد کو برا بھلا کہے تو کیا اسے اسلام سے خارج سمجھو گے؟ اس سے اپنی دینی برادری کو ختم کر دو گے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

شیخ نے کہا:

اصحاب بھی ہمارے روحانی باپ ہیں اور اگر کوئی ان میں سے بعض کے بارے میں بدگمان ہے اور انھیں برا بھلا کہتا ہے تو یہ کام اس کے اسلام اور اسلامی برادری سے خارج ہونے کا سبب نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ مصیبتیں تفرقہ اور دوریاں نہ ہوتیں تو ہمارے یہاں جمع ہونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہم یہاں ایک جگہ بیٹھنے آئے ہیں تا کہ اجتماعی مشکلات اور بیماریوں کے بارے میں تبادلہ خیال کریں اور ان کے بنیادی علاج کی کوشش کریں'

بالآخر شیخ عبدالمجید سلیم نے ان کو نرم کیا لیکن اس واقعہ کے سبب شیخ مذہب شیعہ کی پیروی کے جواز میں فتویٰ دینے میں ناکام ہوگئے اور یہ کام کئی سال مؤخر ہوگیا اور پھر ان کے شاگرد رشید شیخ محمد شلتوت کے ذریعہ انجام

پایا۔ یہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے باعث فخر تھا کہ کیونکہ دنیا مذاہب میں سے کوئی بھی ابھی تک ایسی تقریب اور قربت برقرار نہیں کر پائے ہیں۔ جیسا کہ عیسائیت کے کیتھولک فرقہ والے دوسرے فرقہ پروٹسٹان کو بالکل قبول نہیں رکھتے یہاں تک کہ ابھی تک ایک دوسرے کے نکاح کو قبول کرنے کی حد تک بھی آگے نہیں بڑھ پائے ہیں۔(بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹، ص ۱۹۱ تا ۱۹۴ نیز ۱۳۷۷، ص ۳۴۳)

سلیم کا آیۃ اللہ بروجردی سے رابطہ

عبدالمجید سلیم اور دیگر ارکان تقریب تقریب کی توسیع کے لئے دوسرا ودم جو اٹھایا وہ دیگر ممالک اور دیگر مذاہب کے علماء سے وسیع رابطہ کی صورت میں تھا۔ مختلف ممالک مثلاً پاکستان اور کچھ افریقی و دیگر ممالک سے یہ رابطہ برقرار رہا اور بارہا ان کی مشکلات کے حل کی حد تک آگے گیا۔ اس درمیان تحقیقانہ فقہ کے وارث اور آزاد اندیش مجتہدین کے طور پر شیعہ علماء سے عبدالمجید سلیم اور ان کے بعد ان کے شاگرد محمود شلتوت کے رابطہ نے محققین کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لی۔ رابطہ مختلف طریقوں مثلاً مکاتبہ، نمائندہ، ملاقات وغیرہ سے انجام پاتا تھا۔ آیۃ اللہ بروجردی کے زبانی پیغام کے جواب کے طور پر ان میں کے ایک خط میں شیخ عبدالمجید سلیم لکھتے ہیں:

''آقائے قمی کے ذریعہ زبانی پیغام موصول ہوا۔ حقیر کے اوپر حضرت عالی کے اعتماد اور تقریب بین مذاہب کی طرف آپ کی توجہ کے سلسلہ میں مشکور ہوں''۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۲۷۶)

پھر مسلمانوں کے اسلام کو صحیح سمجھنے میں بدنیتوں کی سازشوں اور اختلاف وتفرقہ کی آگ لگانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تبادلہ رائے وخیال پر زور دیتے ہیں اور علماء کے واجب اقدام کے طور پر کہتے ہیں کہ: ''اس اختلاف وتفرقہ سے متعلق تمام چیزوں کو لوگوں کے ذہن سے دور کریں اور ہم آسان شریعت، اسلامی منصوبہ بندی کو پھیلائیں''۔

آیۃ اللہ بروجردی نے جواب ایک خط لکھا جس میں تقریب کے اغراض ومقاصد کی بہت تعریف کی اور کہا کہ جہاں امکان ہوا میں بھی نفاق کے اسباب کو ختم کرنے میں سعی وکوشش کروں گا۔ اسی اور بھی خطوط ان کے درمیان ردو بدل ہوئے۔

تقریب بین مذاہب اسلامی کی راہ میں عبدالمجید سلیم کی طرف سے آیۃ اللہ بروجردی کے درجہ احترام کو لیکر علامہ محمد تقی قمی لکھتے ہیں:

''جب بھی شیخ عبدالمجید سلیم کے لے آیۃ اللہ بروجردی کا خط لیکر جاتا تھا تو وہ کھڑے ہوجاتے تھے اور خط

کولیکر چومتے تھے پھر بیٹھتے تھے''۔(احمدی و دیگران، ۱۳۷۹، ص ۱۵)

آیۃ اللہ واعظ زادہ طبسی بھی ان دو شخصیتوں کے درمیان رد و بدل ہونے والے خطوط کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''آیۃ اللہ بروجردی اور عبدالمجید سلیم و محمود شلتوت کے درمیان رد و بدل ہونے والے خطوط سے سمجھ میں آتا ہے کہ مرحوم بروجردی راہ اتحاد میں ان کی کوششوں کو سراہتے تھے۔ایک خصوصی جلسہ میں کہا:

مرحوم شیخ عبدالمجید سلیم جب کربلا کی مصیبتوں کا ذکر کرتے تھے ت وکہتے تھے: یہ واقعہ تاریخ اسلام کے دامن پر ایک داغ ہے، اور بہت متاثر ہوتے تھے...''(۱۲) (ایضاً، ص ۲۳۵)

علمائے مذاہب خصوصا آیۃ اللہ بروجردی سے رابطہ برقرار کرنے میں عبدالمجید سلیم اور دیگر تقریب کے افراد اتنے حساس تھے کہ حتی ان کی بیماری اور صحت یابی کی خبر بھی رسالۃ الاسلام میں چھاپتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے دشمن شکن اتحاد میں ہر موقع پر اضافہ ہوتا تھا۔

عبدالمجید سلیم کے آثار

اس مذہبی، علمی و اجتماعی شخصیت نے بہت سے مذہبی و اجتماعی آثار چھوڑے ہیں جن میں تقاریر کا مجموعہ اور فتاویٰ کا مجموعہ شامل ہیں۔محمد عبدالمنعم خفاجی لکھتے ہیں: ''انھوں نے الازہر میں اچھے خاصے آثار چھوڑے''۔ (خفاجی، ج ۱، ص ۲۵۷)

۱۔فتاویٰ: اس بزرگ عالم دین کے تقریبا پندرہ ہزار فتاویٰ ہیں جس کی جمع آوری ان کی علمی و مذہبی شخصیت کی شناخت میں بنیادی اثر چھوڑے گی۔

۲۔تقریب کے سلسلہ میں

اس شعبہ میں بھی ان کی تحریریں، خطوط اور مختلف رسالہ ہیں۔ان کے خطی رسالہ بھی ان کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں مثلاً حرف حق اور اظہار حق میں شجاعت سے پردہ اٹھاتے ہیں۔(ایضاً)

خفاجی نے ان کے آثار کے سلسلہ میں لکھا ہے: ''اسلامی طوائف وغیرہ کی راہ مفاہمت میں بہت سے اسلامی شہروں کے علماء اور ان کے درمیان کتابوں، رسالوں اور خطوط کا رد و بدل ہوا ہے۔ان کی قدر و اہمیت مصر ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ تمام آفاق اسلامی اور تمام طوائف تک پہنچ چکی ہے۔ان کے کچھ خطی آثار ہیں جن کے اندر بیان حق میں شجاعت اور حکام کے سامنے ان کا بے خوف و خطر اظہار دیکھنے کو ملتا ہے''۔(ایضاً، ص ۲)

عبدالمجید سلیم کی وفات

عبدالمجید سلیم نے بالآخر جمعرات کی صبح، ۱۰رصفر ۱۳۷۴ھ (۷راکتوبر ۱۹۵۴ء) کو ۲۷سال کی عمر میں دار فانی کو وداع کہا اور مسلمانوں کو مایہ ناز عالم دین اور مصلح مفکر سے محروم کردیا۔ مجلّہ رسالۃ الاسلام نے ان کی وفات کی مناسبت سے اپنے مقالات کے ضمن میں لکھا ہے: ''شیخ عبدالمجید سلیم نے جمعرات کے روز، ۹رصفر ۱۳۷۴ھ (۷راکتوبر ۱۹۵۴ء) کو وفات پائی۔ اللہ نے ان کو بلا لیا؛ نیک، متقی، پاک، شیخ الاسلام، علم اعلام، مغفور لہ، استاد بزرگ، شیخ عبدالمجید سلیم''۔

اس طرح سے ایسے عظیم انسان کی بساط حیات کو فرشتہ ہائے مرگ نے سمیٹ دیا جس کے تقوی، علم اور راہ خدا میں جہاد کی مثال کم ملتی ہے؛ ایسی شخصیت جس نے افکار دین وملت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی نہ کہ مال جاہ ومنصب کے لئے۔ وہ بڑے وفادار، خوش اخلاق، پاک زبان اور دینی غیرت والے تھے اور راہ حق میں کسی کی روک ٹوک کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس کی دینی غیرت ضرب المثل تھی۔ جب کسی ایسی برائی یا بدی کو دیکھتے تھے جس کو ختم نہ کرسکتے ہوں تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ وہ بجا طور پر امت کی اصلاح کو زندگی کے تمام شعبوں کے اندر دین سے تمسک میں سمجھتے تھے۔ ان کی یادوں سے وابستہ شمعیں ہمیشہ روشن اور ان کی راہ ہمیشہ زندہ و پائندہ۔

حوالے ء

۱۔ اسی عنوان کی ایک تاب سے ماخوذ، محمد عابدی میانجی، خارج فقہ واصول، کارشناس ارشد تفسیر وعوم قرآن (اشتغال بہ تحصیل)

۲۔ 'میت شہالہ'، مدینۃ شہالہ نامی شہر کا ایک گاؤں گاؤں ہے۔ یاقوت کا کہنا ہے: 'منوف' مصر قدیم کے دیہاتوں میں سے ہے جس کا نام فتوحات مصر میں بھی آتا ہے۔ عام طور سے لفظ 'کورہ' بھی اس کے ساتھ لگایا جاتا ہے اور 'کورہ رمسیس ومنوف' کہتے ہیں۔ وہ جگہ جو کھیت اور آبادی وغیرہ سے نیچے ہے اور اس کے کورہ ے حصہ کو اب منوفیہ کہتے ہیں۔ (معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۱۶؛ المعجم الوسیط، ج ۱، ص ۳۸۶ 'لفظ ریف کی توضیح')

۳۔ انیسویں صدی میں مصر میں ایک ثقافتی تعلیمی تحریک کا آغاز ہوا اور جوانوں نے جدید ثقافت رجحان پیدا کیا اور سیکڑوں لوگ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے اور مصر میں نئے مدرسہ کھلے۔ ان حالات میں الازہر پرانی روش سے جوانوں کو جذب کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی سبب کچھ دنوں تک متروک ہوگیا۔ سالوں پر محیط اصلاح پسندانہ اقدامات کے نتیجہ میں (۱۸۷۲ تا ۱۹۳۶) تین تحقیقاتی شعبوں والی (اصول دین، حقوق اسلامی اور زبان وادبیات عرب) موڈرن شکل میں ایک یونیورسٹی بن گئی اور طلباء تخصصی دروس سے پہلے مقدماتی اور عمومی دروس پڑھتے تھے۔ اب بھی کچھ کلاسیں قدیم روش یعنی استاد کے گرد حلقہ لگا کر انجام پاتی ہیں۔ (بی آزار شیرازی، ۱۳۷۷، ص ۳۹۱؛ خفاجی، ج، ص ۱۸۱)

۴۔ یہ کتاب اہل سنت اور شیعہ کے دو مفکرین خطوط پر مشتمل ہے 'امام علیؑ کی قیادت' اور 'ہمارا مذہب اور رہبر' کے عنوان سے۔ فارسی میں

ترجمہ ہوکر بارہا چھپ چکی ہے۔

۵۔دونوں کے درمیان پہلا خط ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ میں ردوبدل ہوا۔

۶۔عبدالمجید سلیم اور محمود شلتوت کے درمیان خصوصی روابط کے سبب اس سلسلہ میں بعد میں بتائیں گے۔

۷۔جماعت تقریب کی تشکیل کے بارے میں شیخ شلتوت 'اطلاعات' نامی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''میرے تعاون کا افتخار پہلے دن سے ہی شکل پا گیا اور الازہر کے سابق صدر استاد مغفور عبدالمجید سلیم نے مجھے دعوت دی اور میں نے سمجھ لیا کہ شیخ مراغی اور عبد الرزاق کی اس سلسلہ میں بڑی آرزوئیں ہیں لہذا میں بھی رسالۃ الاسلام میں قرآنی بحث شروع کردی'' (رسالۃ الاسلام، سال ۱۱، ص ۲۱۹)

۸۔عثمانی کے سقوط کے ساتھ ہی خلافت کے سلسلہ میں بہت سی بحثیں اٹھ پڑیں۔اسی سال قاہرہ میں ایک عظیم کانفرنس خلافت کے بارے میں منعقد ہوئی۔(موثقی، ۱۳۷۱، ج ۲، ص ۴۰)

۹۔ان کے اخلاقی صفات منجملہ ہمہ جہت انصاف پسندی کے بارے میں اخلاقی صفات کے ذیل میں گفتگو کریں گے۔

۱۰۔سلیم کی علمی صلاحیتوں منجملہ فقہی خصوصیات کے سلسلہ میں الگ بحث کریں گے۔

۱۱۔محمد مامون کے بعد الازہر کی صدارت عبدالمجید سلیم (۱۹۵۰ء-۱۹۵۱ء) ابراہیم حمروش (۱۹۵۱ء-۱۹۵۲ء) دوبارہ عبدالمجید سلیم (۱۹۵۲ء) محمد الخضر حسین مالکی (۹۱۵۲ء-۱۹۵۴ء)، عبدالرحمن تاج (۱۹۵۴ء-۱۹۵۸ء) اور بالآخر محمود شلتوت (۱۹۵۸ء) تک پہنچی اور اس تمام مدت میں تقریب کی مدیریت محمد تقی قمی کرتے تھے۔

۱۲۔انکے شاگرد شیخ شلتوت بھی ایسے ہی تھے۔استاد عبدالکریم بی آزار شیرازی ان کے بارے میں لکھتے ہیں: 'وہ اپنے استاد شیخ عندالمجید سلیم کی طرح امام حسین علیہ السلام اور دیگر اہلبیت علیہم السلام پر بنی امیہ کے مظالم سے کافی متاثر تھے اور الازہر میں اپنی صدارت کے دوران الازہر میں عاشور کے دن امام حسین علیہ السلام کے مراسم عزا کا انعقاد ہوتا تھا'۔(بی آزار شیرازی، ۱۳۷۹، ص ۲۰)۔

منابع و مصادر

۱۔احزاب سیاسی در مصر۔

۲۔الفتاوی الاسلامیہ من دار الافتاء المصریۃ، ج ۱۔

۳۔الفتاویٰ الجدیدۃ۔

۴۔احمدی وغیرہ کی کوششوں سے، چشم و چراغ مرجعت، مجلّہ حوزہ کا آیۃ اللہ بروجردی کے شاگردوں سے خصوصی انٹرویو، دفتر تبلیغات اسلامی حوزہ علمیہ قم، قم، ۱۳۹۷۔

۵۔بی آزار شیرازی، عبدالکریم، اسلام آئین ہمبستگی، مؤسسہ انتشارات بعثت، ۱۳۵۴ وزکات علم، چاپ دوم، تہران، ۱۳۷۸۔

۶۔بی آزار شیرازی، عبدالکریم، توحید کلمہ، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۴۰۴ھ ج ۲۔

۷۔شیخ محمود شلتوت، طلایہ دار تقریب، مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی، تہران، ۱۳۷۹۔

۸۔ہمبستگی مذاہب اسلامی، سازمان فرہنگ وارتباطات اسلامی (مجمع جہانی تقریب مذاہب اسلامی)، تہران، ۱۳۷۷۔

۹۔ بیومی، محمد رجب، الازہر بین السیاسۃ وحریۃ الفکر، القاہرہ، دار الہلال، ۱۹۸۳ء۔

۱۰۔ خاطرات حسن البناء، ترجمہ استاد جلال الدین فارسی۔

۱۱۔ خفاجی، محمد عبد المنعم، الازہر فی الف عام، ج ۱۔

۱۲۔ دداج، بایار، دانشگاہ الازہر، تاریخ ہزار سالہ تعلیمات اسلامی، ترجمہ آذر میدخت ومشایخ فریدنی۔

۱۳۔ رسالۃ الاسلام، مجلّہ الاسلامیہ عالمیۃ، دار التقریب بین المذاہب لاسلامیۃ، قاہرہ، سال ۶۔

۱۴۔ رضوی، مرتضی، فی سبیل الوحدۃ الاسلامیۃ، مطبوعات النجاج بالقاہرۃ۔

۱۵۔ رفعت سید احمد، الدین والدولۃ والثورۃ، الدار الشرقیۃ۔

۱۶۔ مشیخۃ الازہر، ج ۲۔

۱۷۔ موثقی، سید احمد، استراتژی وحدت در اندیزہ سیاسی اسلام، مرکز انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی قم، قم، ۱۳۷۱، ج ۲۔

۱۸۔ نقوی، علی محمد، شکوفائی انقلاب اسلامی در مصر، مؤسسہ تحقیقاتی وانتشاراتی نور، تہران، ۱۳۶۱۔

عالم اسلام کا تعارف

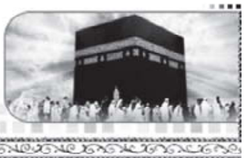

قدیم مصر

The AncientEgypt

(گزشتہ سے پیوستہ)

ر۔امیر دہی
سید نجیب الحسن زیدی

۱۳۔ ثقافتی نشیب وفراز:

اس لحاظ سے کہ اسلام مصر کے راستہ افریقہ میں داخل ہوا، افریقہ بھی مصر کے دریچہ سے جہان اسلام کو دیکھتا ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں اب تک مصر ہی نے افریقہ کے اسلامی معاشروں کو فکری غذا فراہم کی ہے۔

گزشتہ اور حال میں مصر اپنے اندر پائی جانے والی صلاحیتوں اور وسائل کے پیش نظر جہان اہل سنت کے مذہبی افکار کو پرورش دیتا رہا ہے علمائے اہل سنت کی نمایاں شخصیتیں جو دیگر ممالک میں مصروف تبلیغ ہیں یا وہ مصری ہیں یا وہ الازہر یونیورسٹی سے فارغ ہیں۔

مصر میں علمی سطح کی بلندی اس ملک کو یہ امکان فراہم کرتی ہے کہ علمی میدان میں یہ ملک مستحکم قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھے اس سرزمین میں مختلف تفکرات کا پایا جانا بھی اس کی ترقی اور علمی بالیدگی کی راہ میں اہم محرک ہے

.

گزشت زمان کے ساتھ اس ملک میں، ادبی، ثقافتی ،تاریخی، اور سیاسی متعدد نمایاں شخصیات سامنے آئی ہیں۔

عرب کا ادبی لٹریچر مصری ادیبوں سے کافی متاثر ہے اسکی سب سے بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ مصری عرب کی ثقافتی تجدیدحیات کے ہراول دستہ میں رہے ہیں مصری تصنیف کے ساتھ جدید عربی زبان کے ارتقاء میں آگے آگے رہے ہیں، جومعاصر فرہنگ کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ ترقی یافتہ ثقافت سے ہم آہنگ ہے، موجودہ دور میں عرب کے بہترین ناول نگار و مصنفین مصری ہیں۔

موجودہ صدی میں مصر جدید اسلامی اور عربی افکار کے ظہور کا گہوارہ رہا ہے۔ عرب کی سیاسی فکر میں اصلاح پسندی اور فکر نو کے بانی و معمار جمال الدین اسدآبادی کو حاصل ہونے والی کامیابیوں کا اہم حصہ مصر میں قاہرہ کے دوران قیام ہی سے مخصوص ہے۔ انکے بعد رشید رضا اور محمد عبدہ مصری منظرنامے پر حاضر رہے۔

بعض دیگر اسلامی دانشوروں جیسے سید قطب اور حسن البناء کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ۱۳۳۰ کی دہائی سے سید قطب کی کتابیں ایران کے پڑھے لکھے طبقے میں سراہی گئیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ لبرل طرز فکر رکھنے والے دانشوروں میں شیعیت کی طرف مائل عباس عقاد اور طہ حسین کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں اہم سیاسی تنظیم اخوان المسلمین کا ابتدائی ڈھانچہ مصر میں تشکیل پایا اور یہیں سے اس نے اپنے افکار و نظریات کو دیگر اسلامی ممالک میں عام کیا۔

موجودہ دور میں بھی دنیا بھر میں خاص کر افریقہ میں زیادہ تر اسلامی تحریکوں کی ریڑھ کے جوڑوں کو اخوان المسلمین کے موجودہ یا سابق اراکین تشکیل دیتے ہیں۔

''جہاد'' اور ''جماعت اسلامی'' تنظیموں کے اصلی قائدین تحریک اخوان المسلمین کے سابقہ اراکین میں سے ہیں۔

اسلامی ممالک میں موجود اخوان المسلمین کی مختلف شاخوں میں نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصر حسب سابق آج بھی انکے فیصلوں کا اہم اور بااثر مرکز ہے۔ (۔ایضا، ص۔۲۲۔۲۱)

ثقافت اور آداب و رسوم کے اثرات اور تاثیر پذیری:

مصر کی ثقافت میں شیعہ ثقافت کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ مصر میں فاطمیوں کا ۵۰۰ سالہ وجود شیعی

تہذیب وثقافت کے پھلنے پھولنے فروغ پانے اور نشر ہونے کا سبب بنا۔

اگرچہ جب صلاح الدین ایوبی نے مذہب شیعہ کے آثار کو مٹانا شروع کیا تو شیعہ اقلیت میں تبدیل ہو گئے۔

اس کے باوجود آج بھی پہلے کی طرح مصری اہلبیت اطہار اور شیعہ ائمہ علیہم السلام سے عقیدت رکھتے ہیں۔اس عقیدت اور محبت کا مشاہدہ مصر میں موجود زیارت گاہوں اور وہاں پائے جانے والے لوگوں کے اژدہام کو دیکھ کر بخوبی ہوسکتا ہے، خاص کر ماہ مبارک رمضان اور ان شخصیات کی ولادتوں کی مناسبتوں میں مصری تہذیب میں شیعی ثقافت کی جھلکیوں اور نشانیوں کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

۱۴/۱۔ اجتماعی اور ثقافتی تبدیلیوں میں مذہب کا رول:

اسلام کا مصری لوگوں کے ساتھ ایک تاریخی اور تہذیبی ربط ہے اسلام انکے ثقافتی تشخص کی بنیادوں کو تشکیل دیتا ہے۔اسلامی تہذیب وہاں مختلف صورتوں میں جلوہ نمائی کرتی ہے ۔
فردی اور شخصی مسائل میں اسلامی دستورات کی رعایت ،مصر میں ممتاز مذہبی اور روحانی پیشواؤں کی منزلت ،قرأت قرآن کی اہمیت و...اسلامی تہذیب وثقافت کی تجلیات ہیں۔(یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہان اسلام کے مشہور قاریان قرآن مصرہی سے تعلق رکھتے ہیں)

۱۴/۲ا۔آداب ورسوم:{Mannes and culturs}

دیگر مسلم معاشروں اور افریقہ کے شمالی ممالک کی طرح مصری آداب ورسوم کا سرچشمہ بھی مذہب ہی ہے۔ موجودہ دور میں ہم مصر کے اندر مذہب شافعی سے متعلق ایسی بہت سی مخلوط رسموں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو فاطمیوں کے ذریعہ عام ہوئی ہیں اور ان میں شیعی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔یہی رسوم مصر کے عوام کی اجتماعی زندگی میں بھی رچی بسی نظر آتی ہیں۔

مصری جشن اور اعیاد:

ہر ملک میں اسکی قومی اور مذہبی مناسبتوں کا احترام کیا جاتا ہے اور انکی یاد منائی جاتی ہے تا کہ اسکا پیغام

ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہے۔مصر میں بھی اسکے پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ پرانے تاریخی ماضی کے پیش نظر قومی اور رسمی جشن، اور عیدیں منائی جاتی ہیں جنکی کلی فہرست کو ۳محوروں پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

الف: سالانہ یادیں اور دینی جشن:{Annual religious festival}

- ہجری سال کا آغاز پہلی محرم الحرام (جس میں ہجری سال کی ابتدا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت سے ہوتی ہے)
- ۱۲/ربیع الاول ولادت باسعادت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلہ (اہل سنت کے مشہور قول کے مطابق)
- عیدفطر، اختتام ماہ مبارک رمضان (۱/شوال سے ۳/شوال تک)
- عیدقربان، ۹/ذی الحجہ

ب: قومی چھٹیاں:

- صحرائے سینا کی آزادی کا دن، ۲۵/اپریل
- یوم مزدور پہلی مئی
- شم النسیم، بہار کا جشن، ۲مئی۔
- ۲۳جون کا انقلاب (مصر کا قومی دن روز انقلاب کے نام سے منسوب ہے جو ۲۳جون ۱۹۵۲ء سے متعلق ہے جبکہ مصر کا یوم آزادی ۲۸/فروری ۱۹۲۲ء ہے
- مسلح افواج سے منسوب دن ۶/اکتوبر{Armed force day}
- ولادت حضرت عیسی مسیح علیہ السلام ۷/جنوری

مصری تہوار:{Egyption festivals}

- دریائے نیل کی طغیانی سے منسوب دن (وفاء النیل) فرعونی تہوار میں سے ایک
- دلہنوں کو مہندی لگانے کا تہوار
- بچوں کے سات سال پورے ہونے تہوار
- عیسوی سال کا آغاز پہلی جنوری

- قبطیوں سے منسوب نوروز کا جشن

(مصر میں قبطی قوم ہر سال ایک جشن مناتی ہے جسے وہ لوگ عربی میں نیروز کہتے ہیں یہ جشن ہر سال پت جھڑ کے موسم میں منعقد ہوتا ہے یہی قبطیوں کے کلنڈر میں انکے سال کے آغاز کا دن بھی ہے اس جشن کی تاریخ کے بارے میں بعض لوگ یہ مانتے ہیں کہ یہ مصر پر ہخامنشیوں کے تسلط کے دور کی یادگار ہے۔ اگر چہ خود قبطی اسے مصر کے عہد قدیم کی یادگار مانتے ہیں)

۱۴/۳ مصر کی علمی اور ثقافتی سطح:

مصر دنیا کے قدیمی ترین سکونتی علاقوں میں ہے۔ عہد قدیم کے علمی اور ثقافتی آثار کثرت کے ساتھ یہاں پائے جاتے ہیں۔ سنہ عیسوی سے تقریباً ۳۰ صدی پہلے ایشیا سے آنے والے مہاجر اپنے ساتھ پالتو جانوروں، جڑی بوٹیوں اور تراشکاری کے اصول وفنون کے ہمراہ عصر حجر کے عروج کا دور لے کر مصر کے شمالی علاقہ یعنی مصر سفلی میں وارد ہوئے. اس سرزمین پر سکونت اختیار کرنے اور سنگ تراشی میں ترقی کے بعد انہوں نے تانبے سے استفادہ شروع کیا مختصر سے ہی وقفہ میں مصر علیا میں (جنوب) ایک سادہ اور کشادہ تمدن وجود میں آیا. ثقافتی تاریخ کے آثار یہ بتاتے ہیں کہ مصر کے فرعون کافی زمانے سے اسی سرزمین پر رہتے تھے اور ایک قسم کا تمدن بھی انکے یہاں پایا جاتا تھا۔ اس بات کی دلیل کے طور پر مصر کے عہد قدیم کے آثار اور فسطاط (Fostat)

(قدیم اسکندریہ) کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے یہ کشف ہونے والے آثار اسلام سے پہلے کے ہیں۔

اسلامی عہد میں خاص کر فاطمیوں کے دوران حکومت مصری ثقافت اور فرہنگ میں بالیدگی کے ساتھ ارتقاء ونکھار پیدا ہوا۔ بیرونی تاجروں کی آمد ورفت میں اضافہ ہوا جو خود اپنی ذات میں فنی اور ثقافتی تبادل کا سبب بنا. فاطمیوں ہی کے زمانہ میں الازہر یونیورسٹی کی داغ بیل پڑی جس نے علم وثقافت کے رشد وارتقا میں غیر معمولی کردار بنھایا۔

موجودہ دور میں مصر کی ثقافتی میراث کی حفاظت کی ذمہ داری وزارت سیاحت وسفر کے کاندھوں پر ہے

ثقافتی میراث کا بورڈ جو کہ اسی وزارت سے وابستہ ہے تاریخی اور عہد قدیم کے آثار کی حفاظت کے ساتھ مختلف اسکیموں کے ذریعہ سیر و سیاحت کا شوق رکھنے والوں کو لبھانے کی ذمہ داری بھی ہے۔

اگر چہ اس ملک میں بہت سی علمی انجمنیں مصروف عمل ہیں لیکن اس ملک میں جہالت کے گراف کا زیادہ ہونا اس ملک کے علمی طور پر پچھڑے ہونے کے ساتھ علمی اور ثقافتی مسائل میں فقیری کی مار اور اسکے اثرات کو بیان کر رہا ہے (ایضا،ص ۲۵-۲۴)

۱۵۔ ثقافتی مراکز:{Cultural centrs}

مصر دنیا کے بہترین قابل دید تاریخی ممالک میں سے ایک ہے۔ سیاحت، شاید اس ملک کی سب سے اہم یا پہلی آمدنی کا ذریعہ ہے اس ملک کے سیاحت وسفر کے وزیر کے بقول یہ ملک ۱۳۷۹ بہمن تک اسی سیاحت کے ذریعہ ۲۰ لاکھ باواسطہ یا بدون واسطہ مشاغل نکالنے میں کامیاب رہا کہ جس میں قریب ۱۲/۶ فیصدی مقامی مصریوں کا حصہ ہے۔

اس ملک میں میوزیم، کتب خانہ اور دیگر قابل دید متعدد مقامات موجود ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

مصر کا قومی عجائب گھر:

یہ قاہرہ میں تحریر چوراہے پر واقع ہے اس میں فرعونوں کے ۵ ہزار سے زیادہ مصر قدیم سے متعلق آثار کے نمونے موجود ہیں۔

یہ میوزیم ۱۸۵۸ء عیسوی میں تاسیس ہوا. اس میوزیم کا سب سے پر کشش اور خاص حصہ وہ جگہ ہے جہاں فراعین کی مصالحہ لگی ہوئی لاشیں موجود ہیں {Mammy} جن میں رامیسس دوم (جناب موسی علیہ السلام کے زمانے کے فرعون) سے منسوب بھی ممی موجود ہے اس میوزیم کے قابل دید مناظر میں وہ حصہ بھی جس میں توت آنخ فرعون کی بیوی کے سونے چاندی کے زیورات موجود ہیں۔

صلاح الدین چوراہے پر واقع مصطفٰی کامل عجائب گھر

بیت الامہ عجائب گھر، جو ضریح سعد (zarihesaad) سڑک پر واقع ہے جسکا افتتاح ۱۹۵۶ میں ہوا۔

احمد شوقی میوزیم جو جیزہ کے علاقہ میں واقع ہے اور زراعت و کھیتی باڑی کے سلسلہ میں مصر کے قدیمی

عجائب گھروں میں سے ہے۔

جزیرہ میوزیم: (جو قاہرہ کے جزیرہ علاقہ میں واقع ہے) جو ۱۹۵۷ میں تاسیس ہوا۔ یہ مشرق وسطی کے فنی اور بڑے عجائب گھروں میں سے ہے۔

محمد محمود خلیل میوزیم: جس میں ۱۹رویں صدی کے فرانس کے مشہور تصویر نگاروں کے فریم اور ڈرائینگ موجود ہیں۔

الحضارۃ میوزیم (Elhezare) جسے تمدن عجائب گھر بھی کہا جاتا ہے جو ۱۹۴۹ میں قاہرہ کے جزیرہ نامی علاقے میں افتتاح ہوا جس میں مختلف تہذیب وتمدن کے نمونے موجود ہیں۔

معاصر ہنر وفن کا میوزیم جو دقی (Dokki) سڑک پر واقع ہے اور ۱۹۶۷ میں اس افتتاح ہوا ہے۔

اس میوزیم میں تقریبا دنیا کے مختلف مقامات سے جمع کئے گئے ۱۰۲ ہزار اسلامی قدیم آثار کے نمونہ موجود ہیں جن میں خاصی تعداد ایرانی آثار کی بھی ہے۔

اسلحوں کا میوزیم: {Armed museum} اس میوزیم میں جو عابدین کے تاریخی قصر میں ہے جدید اور قدیم اسلحے موجود ہیں اس میں تاریخی اور قدیمی سرد اسلحے بھی موجود ہیں۔

قرآن کا میوزیم:

اس میوزیم میں انواع واقسام کے قرآن جن میں خطی نسخے بھی شامل ہیں محفوظ ہیں۔

دریائی میوزیم: اس موزیم کی قدامت ۱۵۰۰ سال سے بھی قبل کی ہے۔ یہ میوزیم اسکندریہ میں اور قابیتا کے تاریخی قلعہ میں واقع ہے (Ghiebay) اس قلعہ کو ۱۴۷۹ء میں تعمیر کیا گیا کہ جس کا اسکندریہ کی دریائی فانوس سے موسوم مینار دنیا کے ۷ عجائب میں شمار ہوتا ہے اس میوزیم کو ۱۹۶۶ کے زلزلہ میں تخریب کے بعد دوبارہ بنایا گیا ہے۔

اسوان نامی میوزیم: جو تاریخی آثار کے ایک مجموعہ کا حامل ہے مصری حکومت اس کوشش میں ہے

کہ سیاحت وسفر کو آمدنی کے بڑے ذریعہ میں تبدیل کردے۔

۱۹۹۱ء میں مصر کے ثقافتی اور عہد قدیم (Ancient time) سے متعلق آثار کو دیکھنے والوں کی تعداد ۲۰/۸ لاکھ بیان ہوئی ہے یہ تعداد ۹۸۔۹۹ میں ۳۰/۴۵ لاکھ تک پہنچ گئی لیکن ۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ کے حادثہ اور اسکے بعد اس علاقہ کے بعض ملکوں خاص کر افغانستان کے خلاف امریکہ کی جنگ کی وجہ سے مصر کی اس صنعت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اس نقصان کو ۲ ارب ڈالر بیان کیا گیا ہے۔ بہر کیف مصر کے اقتصاد کا خاصا حصہ سیاحت سے جڑا ہوا ہے اور سیاحت کے ذریعہ حاصل ہونے والی درآمد حکومت مصر کے لئے کافی اہمیت کی حامل ہے۔

۱۶۔ عہد قدیم (Ancient time) کے آثار:

مصر سیاحتی وسائل اور تاریخی آثار کے حساب سے دنیا کے پہلے درجہ کے ممالک میں مانا جاتا ہے اس ملک میں عہد قدیم کی تاریخ کی بازگشت صدیوں قبل تک ہوتی ہے مصر کے عہد قدیم کے اہم آثار یہ ہیں:

۱۔۱۶. مختلف قابل دید علاقے:

جیزہ:{Giza}: صوبہ جیزہ کے مرکز کی حیثیت سے یہ جگہ قاہرہ کے کنارے پر واقع ہے

اکثر مصر کے قابل دید مشہور مناظر جیسے اہرام ثلاثہ {Pyramid} ''خوفپس'' {Cheops} یعنی افق سے جڑا ہوا سلسلہ، ''خفرع'' {Khafre} یعنی بڑا ، عظیم المرتبت، ''منکورع'' یا موکرنیوس {Menkaure} یعنیملکوتی اور ابوطول کا مجسمہ (ان اہرام کے نگہبان کے طور پر) اسی حصہ میں موجود ہیں۔

یہ اہرام حکمت ازلی، جاودانی، اور فنون جادوگری کی علامتوں کے طور پر دنیا میں جانے جاتے ہیں

خوفپس'' {Cheops} نامی ہرم ان اہرام میں سب سے بڑا ہرم ہے کہ جسے ۲۶۰۰ قبل سال ۵۵ ہزار مربع میٹر میں تعمیر کیا گیا تھا اسکی اونچائی ابتدا میں ۱۴۶ میٹر تھی لیکن بعد میں اسکے طلائی سائبان کے گر جانے کے بعد اسکی اونچائی ۱۳۷ میٹر رہ گئی ہے اس میں استعمال ہونے والے پتھروں کی سلوں کی تعداد ۲/۵۰ لاکھ ہے۔

''خفرع''{Khafre} نامی ہرم خوفو کے بیٹے خفرع کے ذریعہ بنایا گیا جسکی اونچائی ۱۳۶ میٹر ہے۔

''منکورع'' یا موکرنیوس {Menkaure} سب سے چھوٹی ہرم ہے جسکی اونچائی ۶۲ میٹر ہے۔

ان اہرام {Pyramid} کے بہت سے عجائب ہیں جن میں بعض ابھی بھی ایک راز بنے ہوئے ہیں۔

ابوالھول کا مجسمہ جو اہرام {Pyramid} کی حفاظت کے سمبل کے طور پر اہرام {Pyramid} کے آگے بنایا گیا ہے ایک ایسے شیر کی صورت میں ہے جو بیٹھا ہوا ہے اور اسکی شکل انسان کی ہے زمین سے اسکی سب سے زیادہ اونچائی والا حصہ ۷۰ میٹر اونچا ہے اور اس کا سب سے نچلا حصہ ۲۰ میٹر ہے۔

ان اہرام {Pyramid} کے علاقے میں لوگوں کے نظارہ کے لئے اور بھی مقامات ہیں اور میوزیم ہیں جن میں فراعین کے آثار موجود ہیں

سقارہ { Saggara}: یعنی قبرستانوں کا علاقہ

شہر ممفیس (Memphis) اسی علاقہ کو کہا جاتا ہے (جو قاہرہ کے جنوب میں ۲۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے کسی زمانے میں یہی مصر کا پایۂ تخت ہوا کرتا تھا

یہ علاقہ عہد قدیم میں تعمیر ہوا اور اس میں بہت سے آثار جیسے مقبرے، عبادت گاہیں سقارہ المدرج کا ہرم کہ جسے ملک زوسر {Malkzpsar.Djoser} کے زمانے میں بنایا گیا تھا، بھی موجود ہیں۔ یہ ہرم دنیا کے سنگی اور قدیمی آثار میں ایک اہم اثر ہے اس ہرم کی اونچائی ۶۵ میٹر ہے۔

اسی طرح الجبانۃ الاثریہ اور مقدس گائے کا مقبرہ بھی جو سرابیوم (Serabiyom) کے نام سے مشہور ہے اسی علاقہ میں ہے

المطریہ (Mastate elmatarieh) مصر کے فرعونوں سے متعلقہ ایسا علاقہ ہے جو شہر اون (Aun) کے نام سے مشہور ہے جسے یونان میں ہلیو پولیس (Helybolis) کے نام سے جانا جاتا تھا اس شہر کے باقی ماندہ آثار میں ''المسلہ'' ہے کہ جو مسلۃ المطریہ کے نام سے مشہور ہے۔

الاقصر: نیل کے مشرق میں قاہرہ سے ۶۷۶ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے دنیا کے سب سے بڑے کھلے میوزیم کے طور پر اسے جانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ۳/۱ عہد قدیم کے آثار یہاں موجود ہیں یہ علاقہ ''مدینہ القصور'' کے نام سے معروف ہے اور ۷ ہزار سال تک کے آثار یہاں موجود ہیں۔

قصر الشمع (مصر میں قبطیوں کے آثار کا علاقہ) یہ جگہ مصر کے قدیم علاقہ میں مسجد عمرو عاص کے پیچھے ہے اور مصر کے قدیمی اور تاریخی مرکزوں میں سے ایک ہے جسکی قدامت ۱۷۰۰ سال ہے، جبکہ اسی علاقہ کے بعض تاریخی حصوں کی تاریخ رومانیوں کے زمانے یعنی ولادت عیسیؑ سے بھی ۲۰۳۰ پہلے کی طرف پلٹتی ہے۔

البتہ بعض لوگ چند مساجد، عیسائیوں کے کلیسا اور یہودیوں کے دیر، ایک ساتھ ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کو مجمع الادیان بھی کہتے ہیں (ایضا، فلاح زادہ، ص ۱۰۱-۱۰۰)

اس کے علاوہ اور بھی دیگر تاریخی مقامات مصر میں پائے جاتے ہیں جن میں سے اسکندریہ، آسوان، آسیوط، ابوسمبل، اور جزیرہ نما سینا کے تاریخی آثار کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۱۶/۲ عبادت گاہیں اور مقبرے:{Temple's and mausoleum}

معبد الاقصر: یہ عبادت گاہ عالمی شہرت کی حامل ہے اور اپنے بلند اور ضخیم، کندہ کاری شدہ کمر بندی شکل ستونوں سے معروف ہے اور خدائے آمون (Amoun) کی عبادت سے مخصوص مانی جاتی ہے۔

عبادت گاہ کرنگ: شہر اقصر کے عہد قدیم سے متعلق اہم آثار اور تاریخ بشریت میں عبادت کے لئے بنائی گئی بڑی جگہوں میں سے ایک ہے اس علاقہ میں بہت سی عبادت گاہیں ہیں جن میں سب سے نمایاں خدائے آمون اور اسکی زوجہ کی عبادت گاہ ہے یہ علاقہ حاب الکرنگ اور الحیر ۃ المقدسہ (مقدس جھیل) کے درمیان واقع ہے۔

مقبرہ وادی الملوک: اقصر کے عہد قدیم کے آثار میں شمار ہوتا ہے اس میں بہت سے مقبرے موجود ہے جو دریائے نیل کے مغربی ساحل پر واقع ہیں جن میں سب سے معروف مقبرہ '' توت عنخ آمون (Totankh amon) اور وادی الملکات و ملکہ نفر ناری کا ہے اس جگہ پر قدیمی بادشاہوں کے بہت سے

مقبرے پائے جاتے ہیں۔

ابوسمبل کی عبادت گاہیں:{The gret tempel of abu simbel}

یہ علاقہ جنوب اسوان سے ۲۸۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے ان عبادت گاہوں میں سب سے اہم عبادت گاہ ابوسمبل ہے جو عیسوی صدی سے ۱۲۰۰ سال پہلے رامسیس ثانی کے ذریعہ بنائی گئی اور عبادگاہوں میں سب سے مکمل، بڑی اور خوبصورت عبادت گاہ کے طور پر جانی جاتی ہے۔

اس عبادت گاہ میں چار مجسمے ہیں جن میں ہر ایک کی لمبائی ۲۳ میٹر ہے۔

ان عبادت گاہوں کی علمی اور فلکیاتی حیرت انگیزی اس میں ہے کہ ہر سال ۲۲ اکتوبر اور ۲۲ فروری کی تاریخوں میں ان کے اندر سورج کی کرنیں ڈائرکٹ پہنچتی ہیں۔

مقبرہ آغا خان: اسماعیلی فرقہ کے رہبر آغا خان کا مقبرہ دریائے نیل کے مغربی حصہ میں ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔

دندرہ کی عبادت گاہ: یہ عبادت گاہ شہر قنا کے مغربی حصہ میں تعمیر ہے اسکے اندر داخل ہوتے ہی انسان اس کی خوبصورتی اور رنگ آمیزی کو دیکھ کر متعجب ہو جاتا ہے۔(ایضا، فلاح زادہ، ص ۱۰۱)

۳/۱۶. آثار

مصر میں عہد قدیم کے بے شمار آثار پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ کو فہرست وار پیش کیا جارہا ہے۔

اسکندریہ: ستون جس کی اونچائی ۲۵ میٹر ہے اور جو ۲۹۷ء میں بنایا گیا مقبرہ کوم الشقافہ، رومانی تھیٹر، قلعہ قابیتا،

اقصر: دریای عبادگاہ، مجسمہ ممنون

جزیرہ سینا: سنت کیتھرین چرچ

تل العمارنہ: شہر المینا کے نزدیک مصر کے مشہور عالم سے متعلق ہے

تونا الجبل: قاہرہ سے ۲۷۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ رومیوں کے آثار اور ممی شدہ اجساد یہاں نمائش کے لئے رکھے ہیں۔ (ایضا، فلاح زادہ، ص ۱۰۲)

۱۶/۴۔ قلعے:

قلعہ صلاح الدین: یہ قلعہ سلطان صلاح الدین کے دور میں ۱۱۸۳ء کو حکومتی مرکز کی حیثیت سے تعمیر ہوا پھر بعد میں اس میں رفتہ رفتہ متعدد عمارتیں، من جملہ مسجد محمد علی، مسجد مرمر اور فوج کا میوزیم، بنائی گئیں۔

قلعہ محمد علی: محمد علی پاشا کے زمانے میں بنایا گیا، جو تعمیر کے لحاظ سے چھوٹا ضرور ہے لیکن کافی بلند ہے۔

قلعہ قایتبای: یہ مشہور ترین قلعوں میں ہے جسے الملک الاشرف قایتبای کے دور میں قدیم اسکندریہ کی اونچائی پر اور اسکندریہ کے دریائی چراغ کی جگہ پر بنایا گیا ہے۔

اسکندریہ میں اسی طرح بعض اہم یونانی اور رومی آثار بھی ہیں جیسے یونانی رومی میوزیم، عمود السواری، کوم الشافہ (Kom elshgafe) رومی تھیئٹر۔

۱۷۔ مساجد

مسجد عمرو بن عاص

یہ وہ پہلی مسجد ہے جسے ۲۱ ہجری میں مصر میں بنایا گیا۔ کہا جاتا ہے یہ چودھویں مسجد ہے جو اسلام میں بنائی گئی۔ چونکہ یہ افریقہ کے براعظم میں سب سے پرانی مسجد مانی جاتی ہے اس لئے اسے ''تاج الجوامع'' بھی کہا جاتا ہے۔

مسجد کا داخلی صحن تقریبا تیرہ ہزار پانچ سو مربع میٹر ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ اطراف کا صحن چھت دار اور وسط مسجد کا صحن کھلا ہوا ہے۔

مسجد ابن طولون (Tolon)

۲۶۵ھ مطابق ۸۸۶ء احمد بن طولون کے ذریعہ تعمیر کی گئی مصر کی اسلامی تاریخ میں تعمیر ہونے والی

تیسری مسجد ہے اور اس ملک کی بڑی مساجد میں سے ہے جو ۲۶ ہزار مربع میٹر رقبہ پر بنائی گئی ہے۔

طولون ترکی لفظ ہے جسکے معنی کامل باپ کے ہیں، کہا جاتا ہے کہ طولون ایک ترکی غلام تھا جسے خراج کے ضمن میں بخارا کے حاکم نے ۲۰۰ھ میں خلیفہ عباسی کو بھیجا تھا۔

اس مسجد کا دلکش حصہ مسجد کے باہر اس کے چار گوشے منار ہیں جو ۵۰/میٹر اونچے ہیں۔

مسجد الازہر:

جہان اسلام کی پرانی مساجد و درسگاہوں میں شمار ہوتی ہے جسے ۳۶۱ھ مطابق ۹۷۵ء میں فاطمیوں کے ایک کمانڈر جوہر سسلی نے بنایا تھا منقول ہے کہ الازہر کا لفظ رحمت للعالمین کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے نام سے اخذ کیا گیا ہے۔

اس مسجد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک سال کے دنوں کے حساب سے ۳۶۵ ستون ہیں ہفتہ کے دنوں کی تعداد کے حساب سے سات دروازے ہیں اور نماز پنجگانہ کے پیش نظر ۵ گلدستے ہیں۔

مسجد سلطان حسن:

یہ مسجد سلطان حسن بن محمد بن قلادون کے ذریعہ ۷۵۷ھ مطابق ۱۳۵۶ء میں مدرسہ و مسجد کے طور پر بنائی گئی اور مسلمانوں کے چار مذاہب کے مدرسہ کے طور پر پہچانی گئی یہ اسلامی معماری کے خوبصورت نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ مسجد ۷۹۰۰ مربع میٹر کے رقبہ پر بنی ہے اور اس میں چار مذاہب اسلامی کی تدریس کے لئے چار دالان ہیں ماضی میں مسجد کا بعض حصہ اسپتال کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔

مسجد محمد بن علی:

یہ مسجد ابتدائی طور پر محمد علی پاشا کے ذریعہ بنائی گئی۔ اس کے بعد عباس پاشا اور خدیو اسماعیل کے ذریعہ اسے مکمل کیا گیا یہ مسجد مصر میں عثمانیوں کی معماری کے اعلیٰ اور خوبصورت نمونہ کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔

اس مسجد کے گلدستوں کی اونچائی ۸۵ میٹر ہے اس کا اصلی گنبد ۵۲ میٹر اونچا ہے جس کی گولائی ۲۱ میٹر

ہے۔مسجد کے اونچائی پر ہونے کی وجہ سے صاف موسم میں اس کے ایوان سے قاہرہ کے بہت سے مناظر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مسجد امام الشافعی:

محمد بن ادریس شافعی جو امام شافعی کے نام سے جانے جاتے ہیں اہل سنت کے چار اماموں میں سے ہیں ۲۰۴ھ میں ان کی وفات مصر میں ہوئی۔ان کا مقبرہ اہم اسلامی آثار میں سے ہے اور اس مقبرہ کا گنبد مصر میں موجود بڑے گنبدوں میں سے ایک ہے۔

مسجد الحاکم بامراللہ:

اس مسجد کا ظاہری منظر اتنا دلفریب ہے کہ مصر کی دیگر مساجد میں اس کی نظیر نہیں ہے۔یہ مسجد ٹیونس کی مسجد المہدیہ کے مشابہ ہے جسے چوتھی صدی ہجری کی ابتداء میں بنایا گیا۔

اس مسجد میں مغرب کی معماری کے آثار بھی جھلکتے ہیں اس کا رقبہ ۳۰ ہزار مربع میٹر ہے۔(حسینیان، ۱۳۸۱،ص/۱۰۷)

مسجد الحسین علیہ السلام:

مصر میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مشہور و معروف مزارات میں سے ایک قاہرہ میں راس الحسینؑ کی مقدس مسجد ہے جو اس شہر کے قدیمی علاقہ میں واقع ہے اور ہر گھڑی زائرین محبین اہل بیت علیہم السلام سے بھری رہتی ہے۔

بعض روایات کے مطابق سر امام حسینؑ روز یکشنبہ آٹھ جمادی الثانی ۵۴۸ھ عسقلان سے قاہرہ کی طرف روانہ کیا گیا اور اسی مسجد میں دفن ہے۔(خسروشاہی،۱۴۲۲،ص/۱۷۹)

اسی مقام پر حجرہ آثار پیغمبرؐ کے نام سے ایک حجرہ بھی ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کچھ چیزیں موجود ہیں جن میں آپکی تلوار، ایک عصا، چند بال، لباس پیغمبرؐ کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام اور عثمان

سے منسوب قرآن بھی موجود ہیں۔

سید الشہداؑ کے سر کو مصر منتقل کرنے کے بارے میں بہت سے مطالب ہیں جنہیں اختصار کے پیش نظر ہم ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی لطف سے خالی نہیں ہے کہ مصر میں تقریبا۶۰ لاکھ سید آباد ہیں جنہیں نقابۃ الاشراف کے نام سے جانا جاتا ہے البتہ مصریوں کے نزدیک سادات صرف اولاد حضرت زہرا سلام اللہ علیہا سے ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہاشم (پیغمبرؐ کے جد) کے فرزند بھی اس میں شامل ہیں۔

مسجد اور مقبرہ سیدہ زینبؑ:

یہ ایک عظیم مسجد ہے (مشہور کے برخلاف مصریوں کا اعتقاد ہے) کہ امام علیؑ کی بیٹی اور امام حسین علیہ السلام کی بہن حضرت زینب سلام اللہ علیہا کا روضہ اسی مسجد میں واقع ہے۔

اس مسجد کا رقبہ ۲۰ ہزار مربع میٹر ہے جسکی بارہا ترمیم وتعمیر کے ساتھ مرمت ہو چکی ہے۔اس علاقہ کی تجدید وتعریض کے دوران عثمانی حاکم علی پاشا کے ذریعہ ۹۵۱ھ میں بنائی گئی قدیم مسجد کچھ حصہ بھی کشف ہوا اور ۱۱۷۰ھ میں عبدالرحمٰن کتخدا کے ذریعہ اس کی عمارت کی دوبارہ تعمیر کی گئی اسکے بعد آخری بار اس کی تعمیر نو اور مرمت کے دوران اس سے متعلقہ چوک اور سڑک کو "عقیلہ بنی ہاشم" کے نام سے منسوب کر دیا گیا (خسرو شاہی، ایضا،ص۱۹۱)

مسجد اور مقبرہ سیدہ نفیسہ:

حضرت نفیسہ حسن انور بن زید بن ابلج بن امام حسن مجتبیؑ کی بیٹی ہیں جو ۱۴۵ھ میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے امام صادقؑ کے بیٹے اسحاق موتمن سے شادی کی آپ مصریوں کے نزدیک بہت محترم ہیں اور وہاں کے لوگ آپ کے بہت معتقد ہیں۔آپ کی قبر پر سب سے پہلی بنا والی مصر عبیداللہ بن سری بن حکم کے ذریعہ اموی حکومت کی طرف سے تعمیر ہوئی، پھر اسکے بعد فاطمی حکومت میں ۴۸۲ھ میں اس کے اوپر ایک گنبد تعمیر ہوا جسے ۵۳۲ھ میں

دوبارہ بنایا گیا اس کے بعد بھی اس کی تجدید بنا ہوتی رہی اور پھر اس کے کنارے مسجد کی تعمیر کی گئی (خسرو شاہی، ایضا،۱۹۴۔۱۹۳)

اہلبیت عصمت وطہارت علیہم السلام اور انکے اصحاب سے منسوب قاہرہ میں اور بھی مساجد اور مزارات موجود ہیں جن میں سے اہم بزرگ شخصیتوں کے مزارات یوں ہیں:

مالک اشتر، محمد حنفیہ، محمد بن ابی بکر، سکینۃ بنت الحسینؑ، رقیہ بنت علیؑ، فاطمہ بن الحسینؑ، زید بن علی بن الحسینؑ ابن سیرین (خواب کی تعبیر بیان کرنے والے مشہور معبر)۔

اس کے علاوہ صوفی فرقے کے رہبروں سے متعلق مختلف مساجد اور مزارات بھی یہاں موجود ہیں۔ مصر میں صوفیوں کے ۸۴ فرقے پائے جاتے ہیں۔

۱۸۔کلیسا و دیر۔

کلیسائے معلقہ:

یہ کلیسا قصر الشمع کے علاقے میں بنا ہے اور ۱۷۰۰/سال پرانا ہے اسکی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کلیسا بابلیون کے رومانیوں کے دور کے باقی ماندہ آثار کے بچے ہوئے دو برجوں پر قائم ہے۔ان میں سے ہر ایک برج کی اونچائی تیرہ میٹر ہے یہ کلیسا اس طرح بنا ہے کہ اسکے نیچے کچھ نہیں ہے اور نچلا حصہ بالکل خالی ہے اسی لئے اسے کلسائے معلقہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

کلسائے ابی سرجہ:

یہ چوتھی عیسوی صدی کے آثار میں سے ہے اور رومیوں کے ہاتھوں مارے جانے والے شہیدوں سرجیوس اور دواخوس کے ناموں سے منسوب ہے۔

اس کلیسا میں وہ غار بھی ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ایک ہفتہ تک جناب مریم علیہا السلام، جناب عیسیٰ علیہ السلام اور یوسف نجار کے بیت المقدس کے سفر میں ان لوگوں کی قیام گاہ رہی ہے۔

اس غار میں ایک چشمہ بھی ہے جسکے پانی کو آب مقدس کہا جاتا ہے۔اس کلیسا کے ۱۲ استون ہیں جو جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ۱۲ شاگردوں کی یادگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

کلیسائے باربرہ:{Barbara church}

یہ کلیسا ایک عیسائی لڑکی باربرہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔جس کی داستان یہ ہے کہ تیسری عیسوی صدی میں یہ لڑکی جناب عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے کے جرم میں اپنے مشرک والد کے ہاتھوں جواس زمانے کے بادشاہ کا وزیر تھا قتل کر دی گئی اور جناب عیسی علیہ السلام پر ایمان لانے والے ایک مومن کے ذریعہ اسکی ہڈیوں کو مصر میں منتقل کر دیا گیا اور پھر انہیں اسی کلیسا میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کلیسا کی تاریخ تاسیس چوتھی عیسوی صدی کے اواخر کی طرف پلٹتی ہے۔

کلیسائے مارجرس:{ MorGeor's curch}

یہ کلیسا چوتھی عیسوی صدی سے اب تک باقی ہے رومیوں کے ذریعہ چوتھی صدی میں مارے گئے شہدائے کلیسا میں ''مارجرس'' کے نام سے جانا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کلیسا میں اس پادری کو آزار واذیت دینے کے آثار اب بھی موجود ہیں اور عیسائی ان سے برکت حاصل کرتے ہیں۔

کلیسائے سنت کیتھرین:{Santcatherine}

یہ کلیسا صحرائے سینا کے جنوب میں واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ اسکے پیچھے وادی طور ہے اور وہ درخت جس کے ذریعہ خدائے سبحان نے جناب عیسیؑ سے بات کی تھی اسی کلیسا میں موجود ہے۔ایک تاریخی مسجد بھی اس کلیسا کے نزدیک موجود ہے۔

کلیسائے عذرا

یہ کلیسا درخت عذرا کے کنارے بنایا گیا ہے اور جناب مریم عذرا علیھا السلام سے منسوب ہے جسکی عمر ہزار برس کو چھو رہی ہے کہا جاتا ہے کہ جناب مریم نے اسی درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا عیسائیوں کے اہم مزارات وقبور اسی درخت کے سایہ میں ہیں اور زائرین اس جگہ زیارت کی غرض سے آتے ہیں

مصر سے متعلقہ موضوعات وسیع ہونے کی بنا پر باقی ماندہ مسائل من جملہ مصر کی موجودہ صورت حال آئندہ پیش کی جائے گی۔

حواشی:

منابع وماخذ:

۱۔ برینڈ ااسمتھ ،مصر باستان،ترجمہ:آزیتا یاسائی،انتشارات ققنوس،تہران،چاپ چہارم،۱۳۸۴۔

تکیه ای، مهدی، مصر، مرکز چاپ وانتشارات وزارت امور کارجه، تهران، چاپ دوم، ۱۳۸۴۔
۳۔حسینیان، میر مسعود، نگاہی کوتاہ بہ مصر و دیدنی ہائے زیارتی وسیاحتی آن، انتشارات کتاب نیستان، تہران، ۱۳۸۱
۴۔خسروشاہی، سید ہادی و دیگران، اھل البیت فی مصر، الھدف للا علام والنشر ،قاہرہ، چاپ اول، ۱۴۲۲۔
۵۔روزنامہ الاحرار، مورخہ ۱۳۸۰/۱/۳
۶۔فلاح زادہ، محمد ہادی، جمہوری عربی مصر، انتشارات موسسہ ثقافتی مطالعات وتحقیقات بین المللی ابرار معاصر،
تہران، چاپ اول، ۱۳۸۳۔
۷۔ماجدی، خزعلی، الدین المصری، دار الشروق، عمان، چاپ اول ،۱۹۹۹
http://fa.wikipedia.org۸
http://www.cia.gov/cia/publications/factbook/geos/eg/html..9